1964

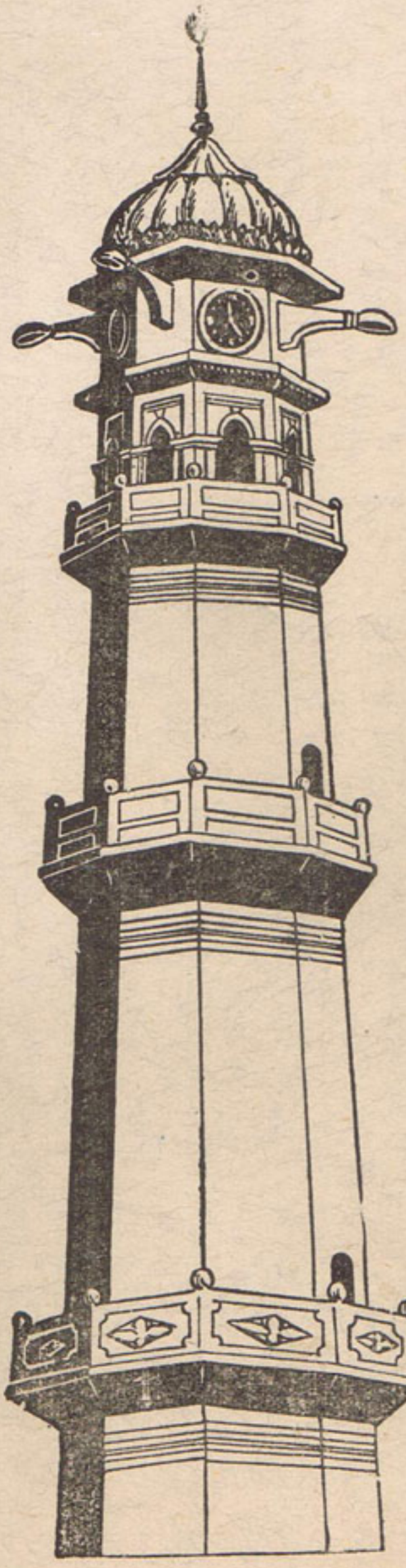

المنار

تعليم الاسلام كالج ربوه

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ

نگران :- شیخ محبوب عالم خالد۔ ایم۔ اے

مدیر اعلیٰ :- عطاء المجیب راشد

مدیران :- سید شمشاد علی ــــ

مبارک احمد عابد ربّانی ــــ

جلد ۱۴ ــــ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۴ء ــــ شمارہ ۲

(سعید ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ سے چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے شائع کیا)

عکس

• تبرکات

والدین کی خدمت و اطاعت

دعا کی تلقین

• آغازِ کار

اداریہ	ادارۂ تحریر
اپنی باتیں	رر

• مقالات و مضامین

ہمارا قومی ادارہ — تعلیم الاسلام کالج ربوہ	داؤد طاہر
ٹیلی ویژن — ایک جدید سائنسی ایجاد	عبدالسبحان سبحانی
تمباکو نوشی	محمود احمد

• گلہائے رنگا رنگ

اپنا خدا (افسانہ)	سعید انجم
آخری فقرات	سلیم الٰہی
"ٹیڈی ہے اب پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" (مزاح)	لطف الرحمٰن محمود
ہمارے سالنامہ پر تبصرہ!	مدیر ہفت روزہ "لاہور"
پگڈنڈیاں	ملک محمد رفیق اسد
	سید نصیر احمد۔ ظفر احمد

• شاخِ گُل

شریکِ محفل :- فیض عالم فیض چنگوی، ارشد ترمذی، لطف الرحمٰن محمود۔ مبارک احمد عابد

قال اللہ تعالیٰ وقال الرسول صلّی اللہ علیہ وسلّم

والدین کی خدمت و اطاعت

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:-

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۲۴-۲۵)

"اللہ تعالیٰ نے اس بات کو فرض قرار دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اس حالت میں بھی کہ تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں ہی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو تو اُن کو کبھی اُف (کلمۂ افسوس) تک نہ کہہ اور نہ سخت کلامی کر بلکہ ان سے معزز طریق سے گفتگو کر۔ تو اُن کے لیے عاجزی اور خاکساری کے بازو جھکائے رکھ اور خدا سے دعا کرتا رہ کہ اے میرے اللہ! میرے والدین نے مجھے بچپن کی حالت میں محبت و شفقت سے پالا تھا تو بھی ان پر بے انتہا فضل و کرم فرما اور رحمت عطا فرما۔" آمین

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو متعدد مرتبہ والدین کی اطاعت اور خدمت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ والدہ کی خدمت کو فرضِ اوّلین قرار دیا اور فرمایا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ان ساری احادیث کا خلاصہ اس حدیث میں آجاتا ہے:-

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَغِمَ اَنْفُهٗ ثُمَّ رَغِمَ اَنْفُهٗ ثُمَّ رَغِمَ اَنْفُهٗ ثُمَّ رَغِمَ اَنْفُ مَنْ اَدْرَكَ اَبَوَيْهِ عِنْدَ الْكِبَرِ اَحَدَهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ۔ (مسلم)

"حضرت ابوہریرہؓ مروی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ تکرار سے فرمایا کہ اس شخص کی ناک خاک آلود ہو (یعنی وہ ذلیل و خوار ہو) جس نے ماں باپ میں سے کسی ایک کو بھی ان کے بڑھاپے کے وقت پا لیا اور پھر دن رات ان کی خدمت کر کے وہ جنت کا حقدار نہ بن گیا۔"

(ع-م-س)

دُعا کی تلقین

(کلمات طیبات سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام)

"مبارک وہ قیدی جو دعا کرتے ہوئے تھکتے نہیں کیونکہ ایک دن رہائی پائیں گے۔ مبارک وہ اندھے جو دُعاؤں میں سُست نہیں ہوتے، کیونکہ ایک دن دیکھنے لگیں گے۔ مبارک وہ جو قبروں میں پڑے ہوئے دُعاؤں کے ساتھ خدا کی مدد چاہتے ہیں، کیونکہ ایک دن قبروں سے باہر نکالے جائیں گے۔ **مبارک تم جبکہ تم دعا کرنے میں کبھی ماندہ نہیں ہوتے** اور تمہاری رُوح دعا کے لئے پگھلتی اور تمہاری آنکھ آنسو بہاتی اور تمہارے سینہ میں ایک آگ پیدا کر دیتی ہے اور تمہیں تنہائی کا ذوق اٹھانے کے لئے اندھیری کوٹھڑیوں اور سنسان جنگلوں میں لے جاتی ہے اور تمہیں **بے تاب اور دیوانہ وار اور از خود رفتہ بنا دیتی ہے**۔ کیونکہ آخر تم پر **فضل کیا جاوے گا**۔ وہ خدا جس کی طرف ہم بُلاتے ہیں نہایت کریم و رحیم، حیا کرنے والا، صادق، وفادار، عاجزوں پر رحم کرنے والا ہے۔ پس **تم بھی وفادار بن جاؤ اور پورے صدق اور وفا سے دعا کرو کہ وہ تم پر رحم فرمائے گا**۔ دنیا کے **شور و غوغا سے الگ ہو جاؤ اور نفسانی جھگڑوں کو دین کا رنگ مت دو**۔ خدا کے لئے ہار اختیار کر لو اور شکست کو قبول کرو تا بڑی بڑی فتحوں کے تم وارث بن جاؤ۔ دعا کرنے والوں کو خدا معجزہ دکھائے گا اور **مانگنے والوں کو ایک خارق عادت نعمت دی جائے گی**۔ دعا خدا سے آتی ہے اور خدا کی طرف ہی جاتی ہے۔ دعا سے خدا ایسا نزدیک ہو جاتا ہے جیسا کہ تمہاری جان تم سے نزدیک ہے۔" (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲۶-۲۷)

اداریہ

کامیاب زندگی وہی ہے جو مقصد کی جستجو اور تکمیل میں صرف ہو اور بالآخر حصولِ مقصد پر منتج ہو۔ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی تخلیق کا مقصد خدائے واحد کی عبادت اور بندگی ہے۔ پس انسان خواہ کسی شعبۂ حیات میں اسرارِ قدرت کی گتھیاں سلجھا رہا ہو یا جادۂ حیات کے کسی موڑ پر خالقِ حقیقی کے رموز کی نقاب کشائی میں مصروف ہو۔ یہ مقصد اس کی آنکھوں سے ایک لحظہ کے لئے بھی اوجھل نہیں ہونا چاہئے کہ عبادت اور بندگی ہماری زندگی کی بنیاد ہے۔ خدا کی بارگاہِ عالی مرتبت کی جاکری میں ہماری عزت و سربلندی اور بقاء و سرخروئی کا راز مضمر ہے۔ اِس راز کو سمجھنا اور اس حقیقت کو اپنے نہاں خانۂ دل میں راسخ کرنا از بس ضروری ہے کہ اس کے بغیر کامیابی اور ترقی کے راستے مسدود ہیں۔ ظاہر بین نگاہ کوتاہ اندیش انسان کو خالقِ حقیقی سے جو سب بادشاہوں کا بادشاہ، سب سے زیادہ طاقت رکھنے والا اور مشکلکشا ہے غافل کر کے مادی اسباب پر تکیہ کرنے کی ترغیب دلاتی ہے۔ لیکن مومن بندے خدائے واحد کا دامن تھام لیتے ہیں اور اس کشاکشِ حیات سے بخیر و عافیت نکل کر ساحلِ مراد تک جا پہنچتے ہیں۔

طلباء کا فرض ہے کہ اس بات کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیں۔ انسان محتاج ہے اور بے حد محتاج۔ قدم قدم پر خدائی نصرت و اعانت کا محتاج۔ خوش بخت ہے وہ انسان جو دعا کو نجات کا ذریعہ یقین کرتا ہے اور اپنے اسباب کو ہیچ خیال کرتے ہوئے اپنے خدا کے آستانہ پر جھکا رہتا ہے۔ (عطاء المجیب راشد)

طالب علمی کا زمانہ صرف نصابی کتب پڑھنے اور انہیں یاد کر لینے کا زمانہ نہیں ہے بلکہ یہ وہ وقت ہے کہ ہم اپنی آئندہ زندگی کی راہیں متعین کرتے اور اپنے کردار کو ہر پہلو سے ثقہ اور مثالی بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ اس زمانے میں ہم پر بہت سی اخلاقی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہمارا فرضِ اوّلین ہے۔

کالج کا طالب علم اس زمانے سے گزر رہا ہوتا ہے جبکہ وہ "عاقل را اشارہ کافی است" کے مطابق صرف اشارہ کا محتاج ہوتا ہے، اسے اپنی منزل کا علم ہوتا ہے۔ اساتذہ اس کی رہنمائی کرتے ہیں لیکن انگلی پکڑ کر اسے منزل کی جانب نہیں بڑھاتے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ توقع کی جاتی ہے کہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے وہ ہر دم تیار ہے۔ قوم کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے دینے میں صرف وقت کی دیوار حائل ہے، وگرنہ جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ خاصی پختگی حاصل کر چکی ہے۔

جب ہم سے اتنی توقعات وابستہ ہیں تو کیوں نہ ہم اپنا بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں؟ کیا واقعی ہم اس قابل ہیں کہ قومی ذمہ داریوں کا بوجھ بقول شخصے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا سکیں؟ کیا ہم واقعی اخلاقی طور پر اس بلند مقام تک پہنچ گئے ہیں کہ قوم ہم پر اعتماد کر سکے؟ اگر ان سوالوں کا جواب مثبت ہے تو پھر پریچوں کے بارے میں دھاندلی کیوں؟ ایگزامینیشن کے متعلق واویلا کیسا؟ اساتذہ کے ساتھ عدمِ تعاون بے معنی؟ محسنوں کے ساتھ محسن کشی کیونکر؟ اور ستم بالائے ستم یہ کہ "کالی بھیڑوں" کے ساتھ ہمدردی کیسی؟

برادران! ہماری اخلاقی ذمہ داریاں ہمیں اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتیں کہ ہم کالی بھیڑوں کے ساتھ کسی قسم کا بھی تعلق رکھیں۔ ہمیں بڑی سے کھلم کھلا نفرت کا اظہار کر کے اپنی اخلاقی بیداری اور معاشرتی جرأت کا ثبوت دینا چاہیئے۔ یہ طریقِ کار ہماری تعمیر کے لئے جس قدر سود مند ثابت ہوگا اس سے بڑھ کر ہمارے بھٹکے ہوئے بھائیوں کی اصلاح کا باعث بنے گا۔

آیئے! ہم صدقِ دل سے عہد کریں کہ اپنے آپ کو کبھی اخلاقی طور پر پست نہیں بنائیں گے۔ اور اپنی ذمہ داریوں کو نہ صرف سمجھیں گے بلکہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

(سید شمشاد علی)

ایک انگریز شاعر کا شعر ہے کہ ہمیشہ انتہائی بلندیاں وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو اس وقت بھی نیند کو خیرباد کہتے ہوئے اپنے کام میں مشغول ہوتے ہیں جبکہ ان کی ساری قوم خوابِ استراحت کے مزے لے رہی ہوتی ہے اور یہی لوگ اپنی قوم کی مضبوط عمارت کے ستونوں کو مضبوطی عطا کرتے ہیں۔ یہ لوگ صرف قوم کو حیاتِ نو نہیں دیتے بلکہ اپنے لئے بھی ابدی حیات حاصل کر لیتے ہیں۔

میرے دوستو! آجکل موسم سرما کی طویل راتیں آپ کو دعوتِ عمل دے رہی ہیں۔ اگر آپ نے ان راتوں میں محنت سے کام کیا تو آپ خوش قسمت ہیں۔ کیونکہ آپ اپنے مقصد اور منزل کے نزدیک پہنچ جائینگے۔

نیز آپ کو کسی قسم کی طبعی کوفت بھی نہیں ہوگی۔ آپ تین چار گھنٹے خوب دل لگا کر پڑھیں۔ پھر دس بارہ گھنٹے کی رات میں سے چھ سات گھنٹے لمبی تان کر سوئیں۔ مجھے افسوس ہوتا ہے اُن لوگوں پر جو اپنے امتحان میں ناکام و نامراد رہتے ہیں۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ یہ طالب علم آجکل کی طویل راتوں میں کرتے کیا ہیں۔ مان لیا کہ دن بھر گہما گہمی سیر و تفریح، گپ بازی میں منہمک رہے۔ مگر رات کے طویل لمحات کہاں ضائع کرتے ہیں، لغویات میں یا سو کر؟ رات کی طویل گھڑیوں میں اتنا زیادہ سونے کا مقصد؟ ــــ شاید یہ میرے دوست نہیں جانتے کہ زیادہ سونا صحت کے لئے بھی نقصان دہ ہے۔ اور ان دوستوں کی ترقی میں بھی ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ کسی نے کیا پُر حکمت بات کہی ہے ــــ پہلے سونا آخر پہ رونا ــــ

شاید کچھ نیند کے متوالوں کو لحاف کی گرمی سے ہی جلد نیند آجاتی ہو۔ یا یونہی ایک دو جمائیاں آئیں تو وہ جھٹ پٹ آنکھیں بند کر کے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہوں۔ ایسے اصحاب کے دلوں میں اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ انہوں نے ماں باپ کے روپیہ کو ضائع نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی اپنا وقت ضائع کرتا ہے تو وہ یقیناً اُس وقت تک نہیں سوئیں گے جب تک کہ وہ روزانہ دو تین گھنٹے نہ پڑھ لیں۔ اگر آپ کے اندر امتحان میں کامیاب ہونے کے لئے کام کرنے کا عزم پیدا ہو جائے تو آپ یقیناً اپنا کھانا پینا بھی بھول جائیں گے۔ ذرا عزم کر کے دیکھیں تو ــــ ذرا اپنے دل میں یہ فیصلہ تو کریں کہ آپ نے اب کے سرما میں سو کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا اور نہ ہی فضول لغویات میں حصہ لینا ہے۔ بلکہ آپ نے صرف اور صرف اپنے موجودہ مقصد یعنی علم حاصل کرنے پر پورا زور دینا ہے تو میں آپ کو اعلیٰ کامیابی و کامرانی کا یقین دلا سکتا ہوں ــــ!

اگر آپ ان طویل راتوں میں خوب دلجمعی، خلوص، مستقل مزاجی، جوش و خروش اور باقاعدگی سے اپنی پڑھائی کا خیال رکھیں گے تو وہ دن دور نہیں جبکہ آپ اپنی اس محنت کا میٹھا پھل کھائیں گے۔ اگر آپ نے ان راتوں میں اپنے کالج کی پڑھائی کے لئے نہ کہ ناول بینی کے لئے، آدھی آدھی رات تک دیئے جلائے تو یاد رکھیں کہ انشاءاللہ تعالیٰ جلد ہی آپ کی آشاؤں کے دیپ بھی جلنے لگیں گے ــــ اٹھو! جاگو! میرے دوستو اور راتوں کو جاگ جاگ کر اپنی کتابوں کے مطالب اپنے دل و دماغ میں جذب کر لو۔ تا کہ تم اپنے مستقبل کی قسمت جگا سکو۔ ورنہ سنہرے سپنوں اور سہانے خوابوں میں منہمک رہنے والے ہمیشہ ہی نقصان اٹھاتے ہیں۔

(عابد ربانی)

اپنی باتیں

- المنار کا گزشتہ شمارہ سالنامہ تھا۔ ہمارے دل جذباتِ شکر و امتنان کے ساتھ رب العزت کے حضور سجدہ ریز ہیں جس نے ہمیں سالنامہ پیش کرنے کی توفیق دی اور پھر اسے قبولیت عطا فرمائی۔ یہ امر ہمارے لیئے ازحد مسرت کا باعث ہے کہ سالنامہ آپ کے معیار پر پورا اترا۔ اس سلسلہ میں ہم اپنے سب کرمفرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ حسب سابق آپ اپنے رشحاتِ قلم اور مفید مشوروں سے ہماری اعانت فرماتے رہیں گے۔ ہمارے سالنامہ پر مؤقر ہفت روزہ "لاہور" کا تبصرہ اس شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں!
- گزشتہ شمارہ میں ہم نے ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا تھا جس کا عنوان تھا "اصلاحِ معاشرہ میں طالب علم کا کردار" ہمیں افسوس ہے کہ بہت کم طلبہ نے اس طرف توجہ کی ہے۔ اس لیئے اس شمارہ میں ہم نتیجہ کا اعلان نہیں کرتے اور طلبہ کو ایک مرتبہ پھر دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس عنوان پر طبع آزمائی فرمائیں۔ اول اور دوم آنے والے طلبہ انعام کے حقدار ہوں گے۔
- اس شمارہ کے لئے ہمیں بہت سی نگارشات موصول ہوئیں جو ہم جگہ کی قلت کے باعث شامل نہ کر سکے ہم سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے قلمی معاونت جاری رکھنے کی درخواست کرتے ہیں۔
- بعض طلبہ ایسے مضامین بھیجوا دیتے ہیں جنہیں پڑھنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ اس لیئے طلبہ سے ہماری گزارش ہے کہ وہ مضمون لکھتے وقت کاغذ کا نصف حصہ خالی چھوڑ دیا کریں اور خوشخط مضامین تحریر کیا کریں۔
- المنار کے بارہ میں آپ کے مفید مشورے اور تعمیری تنقید ہمارے لیئے آپ کی توقعات کی بہتر عکاسی کرنے میں بہت ممد ہو سکتے ہیں اس طرف بھی توجہ فرمائیں!

(ادارہ)

مقالات و مضامین

• داؤد طاہر
• عبدالسبحان سُبحانی
• محمود احمد

داؤد طاہر
بی۔ اے سال دوم

ہمارا قومی ادارہ
تعلیم الاسلام کالج ربوہ

(قسط ثانی)

المنار کے گزشتہ شمارہ میں خاکسار نے اس موضوع پر کالج کا سوانحی خاکہ پیش کیا تھا۔ دوسری اور آخری قسط میں کالج کے علمی، ادبی اور ورزشی سرگرمیوں کے مجموعی جائزہ کے علاوہ دیگر متعلقہ کوائف ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں۔ (داؤد طاہر)

تعداد طلباء کالج

قادیان میں کالج کے افتتاح تک ۱۵ طلباء داخلہ لے چکے تھے[1]۔ اس کے بعد کے سالوں میں طلباء کی تعداد حسب ذیل رہی ہے:-

سنہ ۴۸-۴۷ء	۱۵ کے لگ بھگ	سنہ ۵۴-۵۳ء	۵۲۳	سنہ ۶۰-۵۹ء	۶۹۳[7]
سنہ ۴۹-۴۸ء	۱۳۰	سنہ ۵۵-۵۴ء	۴۳۶[4]	سنہ ۶۱-۶۰ء	۶۲۸[8]
سنہ ۵۰-۴۹ء	۲۹۶[2]	سنہ ۵۶-۵۵ء	۵۲۴	سنہ ۶۲-۶۱ء	۴۹۸
سنہ ۵۱-۵۰ء	۳۲۵	سنہ ۵۷-۵۶ء	۶۰۷[5]	سنہ ۶۳-۶۲ء	۵۲۶[9]
سنہ ۵۲-۵۱ء	۳۷۲	سنہ ۵۸-۵۷ء	۶۸۵	سنہ ۶۴-۶۳ء	۶۶۴[10]
سنہ ۵۳-۵۲ء	۴۳۳[3]	سنہ ۵۹-۵۸ء	۷۳۲[6]		

---

[1] دیکھئے "الفضل" ۲۴ جون ۴۷ء۔ [2] دیکھئے کالج رپورٹ سنہ ۵۰-۴۹ء مطبوعہ الفضل ۵۵/۳/۴۔ [3] کالج رپورٹ سنہ ۵۵-۵۳ء۔ [4] کالج کے ربوہ سے منتقل ہونے کی وجہ سے تعداد طلباء میں کمی ہو گئی۔ [5] کالج رپورٹ سنہ ۵۷-۵۶ء۔ [6] کالج رپورٹ سنہ ۵۹-۵۸ء۔ [7] کالج رپورٹ سنہ ۶۰-۵۹ء۔ [8] کالج رپورٹ سنہ ۶۲-۶۱ء۔ [9] دیکھئے رپورٹ سالانہ صدر انجمن احمدیہ پاکستان سنہ ۶۳-۶۲ء ص ۱۰۔ [10] کالج رپورٹ بابت سنہ ۶۴-۶۳ء مطبوعہ المنار جلد ۲ شمارہ ۱۔

نتائج

تقریباً ہر امتحان میں ہمارے کالج کے نتائج کی اوسط یونیورسٹی اور بورڈ کے نتائج کی اوسط سے بڑھ کر رہتی ہے ذیل میں چند سنین کے اعداد و شمار پیشِ خدمت ہیں :-

سن	بی - اے		بی - ایس سی		ایف - اے		ایف - ایس سی	
	اوسط P.U	اوسط کالج	اوسط P.U	اوسط کالج	اوسط یونیورسٹی بورڈ	اوسط کالج	اوسط یونیورسٹی بورڈ	اوسط کالج
سنہ ۴۹-۵۰ء[1]	39.8	83.8	--	--	--	--	--	--
سنہ ۵۰-۵۱ء[2]	--	--	51.4	60.00	--	--	33.6	39.1
سنہ ۵۱-۵۲ء[3]	36.8	50.00	43.2	100.00	34.2	43.2	36.6	44.6
سنہ ۵۳-۵۴ء[4]	32.7	71.4	--	--	--	--	--	--
سنہ ۵۶ء[5]	36.3	53.8	--	--	--	--	22.5	41.4
سنہ ۵۷-۵۸ء[6]	--	--	39.8	50.00	30.5	45.2	37.8	59.2
سنہ ۵۸-۵۹ء[7]	45.3	87.5	--	--	35.6	56.7	39.00	72.1
سنہ ۵۹-۶۰ء[8]	44.9	62.8	48.5	69.00	32.00	40.00	--	--
سنہ ۶۰-۶۱ء[9]	سالِ اوّل	60.00	--	86.67	--	--	--	--
سنہ ۶۱-۶۲ء[10]	"	87.00	--	65.00	--	96.00	--	89.00
	سالِ دوم	100.00	--	100.00	--	80.00		77.00

[1] دیکھئے کالج رپورٹ ۴۹-۵۰ء [2] بحوالہ کالج رپورٹ ۵۰-۵۱ء [3] کالج رپورٹ ۵۱-۵۲ء - اِس سال کالج کے ایک طالب علم مرزا بشارت احمد بی - اے کے امتحان میں مجموعی طور پر یونیورسٹی میں تیسرے درجہ پر آئے [4] کالج رپورٹ ۵۳-۵۴ء [5] کالج رپورٹ ۵۶-۵۷ء [6] رپورٹ ۵۸-۵۹ء - اِس سال کانووکیشن کے موقع پر کالج کے ایک طالب علم مکرم چوہدری محمد سلطان اکبر صاحب (ایم - اے (جو آجکل اسی کالج میں عربی کے لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں) کو بی - اے آنرز کے امتحان عربی میں یونیورسٹی میں اوّل آنے پر یونیورسٹی کی طرف سے عطا کردہ طلائی تمغہ دیا گیا (دیکھئے الفضل ۱۷/۶/۵۸) [8] سالانہ رپورٹ کالج ۵۹-۶۰ء [9] بحوالہ سالانہ رپورٹ کالج ۶۰-۶۱ء [10] اس سال ... (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳ پر ملاحظہ ہو)

کالج کی علمی و ادبی سرگرمیاں

کالج یونین (یا مجلس عمومی) کالج کی سب سے بڑی مجلس ہے۔ کالج کے جملہ طلبہ اس کے ممبر ہیں۔ اس مجلس کا سب سے اہم فرض طلباء کو فنِ تقریر میں نام پیدا کرنے کی مشق کروانا ہے۔

اس مجلس کے زیرِ اہتمام پہلے بین الکلیاتی مباحثات ۱۹۶۳ء میں ہوئے۔ عناوین زیرِ بحث یہ تھے:۔

اردو:۔ (۱) اسلامی ممالک کا اتحاد ہی مسلمانوں کے مستقبل کو روشن بنا سکتا ہے۔

(۲) اشتراکیت ایک ناقص ضابطۂ حیات ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲

(۱) ایف۔ ایس سی (پری میڈیکل) کے امتحان میں ہمارے کالج کے حمید احمد خان صاحب (برادرِ اصغر مکرم نصیر احمد خان صاحب لیکچرار کالج ہذا) بورڈ بھر میں اوّل رہے۔

(۲) ایف۔ اے کے امتحان میں اعجاز الحق صاحب قریشی بورڈ بھر میں دوسرے درجہ پر رہے۔

(۳) بی۔ ایس سی کے امتحان میں سید امین احمد فزکس کے مضمون میں یونیورسٹی میں اوّل رہے۔

۵۹ اِسال بی۔ اے سالِ اوّل کے امتحان میں اعجاز الحق صاحب قریشی نے یونیورسٹی میں دوم پوزیشن حاصل کی اور ہائر سیکنڈری امتحان میں عطاء المجیب صاحب راشد نے امتیازی مقام حاصل کیا۔ (دیکھئے رپورٹ کالج ۶۲-۱۹۶۱ء)۔ سنہ اس سال اعجاز الحق صاحب قریشی بی۔ اے آنرز (سالِ دوم) کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں تاریخ میں اوّل رہے (کالج رپورٹ ۶۳-۱۹۶۲ء) اسی طرح کالج کے ایک طالب علم فضل الرحمٰن نے ریاضی میں یونیورسٹی بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔

۱۹۶۲ء میں منعقد ہونے والے بی۔ اے کے امتحان میں عطاء المجیب صاحب راشد نے یونیورسٹی کی طرف سے دو طلائی تمغے یعنی "ڈینے مالیر کوٹلہ میڈل" اور "خلیفہ محمد حسن جوبلی گولڈ میڈل" حاصل کئے۔ انہیں اوّل الذکر میڈل عربی پڑھنے والے جملہ طلبہ میں اوّل رہنے اور مؤخر الذکر عربی کے اختیاری مضمون میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر ملا (الفضل ۱/۱۴ ۱۵) نیز اس نمایاں امتیاز کی بناء پر انہیں یونیورسٹی کی طرف سے وظیفہ کا حقدار بھی قرار دیا گیا ہے۔

اس سال اعجاز الحق صاحب قریشی بی۔ اے ہسٹری (آنرز) سال سوم میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہے۔

ہمارے کالج کو یہ خصوصی امتیاز بھی حاصل ہے کہ کالج کی طرف سے ایم۔ اے عربی (Previous) کے امتحان میں پہلی دفعہ appear ہونے والی کلاس میں سے تین طلباء نے یونیورسٹی میں پہلی دو پوزیشنز حاصل کیں۔ چنانچہ چوہدری محمد صدیق صاحب یونیورسٹی بھر میں اوّل اور ناصر الدین صاحب و بشارت الرحمٰن صاحب دوم قرار پائے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

۱۹۶۳ء میں فائنل کے امتحان میں چوہدری محمد صدیق صاحب نے یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

English: (i) Pakistan's strength lies in the litracy of its masses.

(ii) U. N has failed to achieve world peace.

تقریباً چودہ کالجز کی ٹیمیں ان مباحثات میں شریک ہوئیں۔ اردو ٹرافی میڈیکل کالج لاہور نے جیتی اور انگریزی ٹرافی گورنمنٹ کالج لاہور کے حصہ آئی۔

مختلف اوقات میں بڑی بڑی شخصیتیں اس مجلس کے زیر اہتمام طلباء سے خطاب کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ۵۰-۱۹۴۹ء میں شیخ بشیر احمد صاحب (ایڈووکیٹ فیڈرل کورٹ لاہور) نے تقریر کی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر اے۔ ایم زتشی گلزار، ایم۔ اے ایل ایل بی۔ ایچ یو نے "کیا ادب ملک و قوم کی تعمیر و تنظیم کے لئے ضروری ہے؟"، ۵۲-۱۹۵۱ء میں فلائٹ لیفٹیننٹ M. W. Banck نے "ایئر فورس"، چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب وزیر خارجہ پاکستان نے "مسئلہ کشمیر"، ۵۵-۱۹۵۴ء میں پرنسپل احمد عابد علی آف سرگودھا نے "The role of Islam in modern age" اور لاہور کے Dr. Sheats نے "Shutting doors" کے موضوعات پر طلباء کے سامنے اظہار خیال کیا۔ نیز مشہور اطالوی مستشرق پروفیسر اے بھوسانی کا لیکچر بھی کروایا گیا۔ اسی طرح ۵۷-۱۹۵۶ء کے دوران پروفیسر شیکلین سائنٹفک ایڈوائزر راک فیلر فونڈیشن و پروفیسر امریٹس منسوٹا یونیورسٹی امریکہ، پروفیسر برونوف ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف فزالوجی اکیڈمی آف سائنس U.S.S.R. اور میجر عثمان بیگ آفندی آف ترکی، ۱۹۵۸ء میں برطانوی سائنس دان M. G. Bennett اور روسی سائنسدان Mr. Leonid Sedov، ۵۹-۱۹۵۸ء کے دوران قاضی محمد اسلم صاحب، صدر شعبۂ فلسفہ کراچی یونیورسٹی، مسٹر تھیوڈور، جو ان دنوں غبارے میں بیٹھ کر دنیا کا سفر کر رہے، چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نائب صدر عالمی عدالت ہیگ اور ۶۰-۱۹۵۹ء کے تعلیمی سال میں ڈاکٹر محمد عودہ ----- اخبار الجمہوریہ کے سیاسی ایڈیٹر نے ("عرب کے مسائل" کے موضوع پر) طلباء سے خطاب کیا۔ اسی سال مرغوب صدیقی صاحب، صدر شعبہ جرنلزم پنجاب یونیورسٹی، سردار دیوان سنگھ مفتون مدیر "ریاست" دہلی نے بھی کالج کے طلباء کو اپنے خطابات سے نوازا۔ ۶۱-۱۹۶۰ء میں خان عبدالحئی صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج سرگودھا نے "طلباء کی ذمہ داریاں"، کیمبرج یونیورسٹی کے Dr. E. T. I. Rosenthal نے "Islamic Constitution" اور سر ہنری میلول (Sir Henry Melluille) سابق پروفیسر برمنگھم یونیورسٹی نے "Ion Exchange" کے موضوعات پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا۔ ۱۹۶۲ء کے آغاز میں حکومت مغربی پاکستان کے سیکرٹری تعلیم نے ہمارے کالج میں قدم رنجہ فرمایا اور طلباء سے خطاب بھی فرمایا۔ ۶۳-۱۹۶۲ء کے تعلیمی سال کے دوران ڈاکٹر ولیم کرک (Dr. William Karrak) نے "امریکی طالب علم کی زندگی" کے موضوع پر انگریزی زبان میں تقریر کی اور ۶۴-۱۹۶۳ء کے دوران Mr. Quigly، نائب

سیکرٹری برٹش کونسل لاہور نے "Reading Shakespear" پر تقریر کی۔ اسی طرح چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب جج عالمی عدالت ہیگ نے طلباء کے سوالات کے جوابات دیئے۔

(یاد رہے ناموں کے ساتھ جو عہدہ تحریر کیا گیا ہے یہ اُس وقت کا ہے جب کہ فاضل مقرر کالج کے طلباء سے خطاب کرنے کے لئے تشریف لائے)

اس مجلس کے نگرانوں میں سے جو وقتاً فوقتاً بدلتے رہے ہیں، مکرم محمد مقبول الٰہی صاحب ایم۔ اے، مکرم نصیر احمد خان صاحب ایم۔ ایس سی اور مکرم مرزا انس احمد صاحب ایم۔ اے کے نام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں آجکل یونین کے نگران مکرم ڈاکٹر سلطان محمود صاحب شاہد ایم۔ اے، پی۔ ایچ ڈی، اے۔ آر۔ آئی۔ سی ہیں۔ گزشتہ کئی سال سے سوائے اس کے کہ آپ بیرونِ ملک تشریف لے گئے ہوں، یہ عہدہ آپ کے پاس ہی ہے۔

مختلف سنین میں جو طلباء Presidents اور Student رہے ہیں ان کے نام یہ ہیں:-

۴۹-۵۰ء	شیخ حسام الدین	۵۷-۵۸ء	مرزا انس احمد
۵۰-۵۱ء	سردار رشید احمد قیصرانی	۵۸-۵۹ء	مرزا حنیف احمد
۵۱-۵۲ء	سید نصیر احمد شاہ	۵۹-۶۰ء	عبد اللہ ابوبکر
۵۲-۵۳ء	چوہدری امان اللہ	۶۰-۶۱ء	نعیم احمد طاہر
۵۳-۵۴ء	کنور ادریس	۶۱-۶۲ء	فضل احمد
۵۴-۵۵ء	خالد بشیر	۶۲-۶۳ء	ارشد ترمذی
۵۵-۵۶ء	عطاء الکریم شاہد	۶۳-۶۴ء	محمد کریم قمر

بزمِ اُردو: - اس بزم کا مقصد طلبہ میں اُردو ادب کے مطالعہ اور اُردو لکھنے، پڑھنے، بولنے اور سمجھنے کا شوق پیدا کرنا ہے۔ پہلے اس کے نگران مکرم شیخ محبوب عالم صاحب ایم۔ اے تھے، آجکل یہ بارِ گراں محترم پروین پروانہ صاحب ایم۔ اے کے کندھوں پر ہے جسے آپ نے بڑی خوبی، ہمت اور استقلال کے ساتھ اٹھایا ہوا ہے۔

گزشتہ دو تین برس کے اندر اس بزم کے تحت مولانا صلاح الدین احمد مرحوم، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر عبدالبصیر پال، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر مرزا ریاض احمد صاحب آف گورنمنٹ کالج سرگودھا، محمد عارف صاحب ایم۔ اے آف سٹیٹ بنک آف پاکستان (سابق صدر سٹوڈنٹس یونین گورنمنٹ کالج لاہور) پروفیسر جیلانی کامران لاہور، سید حاذر رضا صاحب کمشنر سرگودھا ڈویژن، مسٹر جسٹس سجاد احمد جان اور مسٹر جسٹس انوار الحق ہائیکورٹ

مغربی پاکستان لاہور، جناب زیڈ۔ اے ہاشمی وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی لائلپور، اور جناب منظور قادر صاحب سابق وزیر خارجہ پاکستان و چیف جسٹس مغربی پاکستان ہائی کورٹ لاہور مختلف موضوعات پر طلباء سے خطاب فرما چکے ہیں۔

یہ بزم ہر سال ایک مشاعرہ بھی منعقد کرتی ہے جس میں ملک کے کئی نامور شعراء شرکت کرتے ہیں۔ امسال بزم اردو کے زیر انتظام ایک کُل پاکستان اُردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کے بہت سے نامور حضرات نے شرکت کی۔ ان میں سے ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر سید وقار عظیم (شعبہ اُردو دانشگاہ پنجاب)، شیخ ممتاز حسین صاحب (صدر شعبۂ اردو زرعی یونیورسٹی لائلپور)، خضر تمیمی صاحب (ایڈووکیٹ لاہور)، سہیل بخاری صاحب (سرگودھا) ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، سید سجاد باقر رضوی (شعبۂ اُردو دانشگاہ پنجاب) کے نام خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ جناب اختر حسین صاحب (صدر انجمن ترقی اردو پاکستان) اور ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی وائس چانسلر دانشگاہ کراچی (جو بذاتِ خود یہاں تشریف نہ لا سکے تھے) نے اس موقع پر اپنے گرانقدر پیغامات سے نوازا ——— یہ کانفرنس بحیثیتِ مجموعی بڑی کامیاب رہی۔

مجلسِ ارشاد:۔ اس مجلس کا قیام طلباء میں مذہب سے وابستگی اور روحانی و اخلاقی اقدار کو اپنانے کا شوق پیدا کرنے اور انہیں صحیح اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کے لیئے لایا گیا ہے۔ نگران محترم ملک محمد عبداللہ صاحب ہیں۔

کالج میں مجلس عربی، سائنس سوسائٹی، پولیٹکل سائنس سوسائٹی، اکنامکس سوسائٹی، مجلسِ فلسفہ و نفسیات، مجلسِ ریاضی، بزمِ فارسی اور مجلسِ تاریخ وغیرہ بھی قائم ہیں جو اپنی حدود میں اچھا کام کر رہی ہیں۔

ان مجالس کے نگران اساتذہ بالترتیب مکرم محمد اسلم صاحب صابر، مکرم پروفیسر حبیب اللہ خان صاحب، مکرم شیخ منور شمیم صاحب، خالد، مکرم رشید احمد صاحب جاوید، مکرم مرزا انس احمد صاحب، مکرم و محترم چوہدری حمید اللہ صاحب، مکرم چوہدری عطاء اللہ صاحب اور مکرم عبدالرشید صاحب فوزی ہیں۔

بعض مجالس پہلے قائم تھیں مگر اب ان کا وجود باقی نہیں ہے۔ مثلاً ریڈیو اور فوٹوگرافک سوسائٹی۔ اس کے علاوہ ایک کلب ایرو ماڈلنگ کلب بھی ہوا کرتا تھا۔ اس کا قیام ۵۴-۱۹۵۵ء کے تعلیمی سال میں ہوا۔ اس کا مقصد طلبہ میں ہوابازی اور اس سے متعلقہ مسائل میں دلچسپی پیدا کرنا تھا۔ اسی مقصد کے تحت مختلف قسم کے ماڈلز خریدے گئے اور دس کے قریب طلبہ نے خود بنائے۔ نومبر ۱۹۵۴ء میں پریذیڈنٹ ایرو کلب لاہور کی موجودگی میں مختلف قسم کی پرواز کی نمائش کی گئی جسے اہالیانِ ربوہ نے بہت ذوق و شوق سے دیکھا اور سراہا (کالج رپورٹ ۵۵-۱۹۵۴ء)

صحتِ جسمانی

جہاں ہمارا یہ قومی اور جماعتی ادارہ طلباء کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی اپنی طرف سے، بھرپور

کوشش کرتا ہے وہاں یہ ادارہ ان کی جسمانی صحت کا بھی پورا پورا خیال رکھتا ہے تاکہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء جب عملی زندگی میں قدم رکھیں تو ان کے قدم لڑکھڑائیں نہیں بلکہ مضبوطی اور توانائی کے ساتھ زندگی کی بے پناہ ذمہ داریوں کو اٹھاتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دے سکیں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے کالج میں مختلف کلب قائم ہیں جن میں سے کشتی رانی کلب (Rowing Club) کا نام سرفہرست آتا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد جونہی کالج لاہور منتقل ہوا کشتی رانی کلب قائم کر دیا گیا تھا جو آج تک خدا کے فضل سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کر رہا ہے

اس سے قبل پنجاب یونیورسٹی بمپنگ ریسز میں ہمارے کالج کی ٹیم دوسرے نمبر پر تھی مگر بمطابق کالج رپورٹ ۱۹۵۱-۵۲ء اس سال باوجود پہلی اور دوسری ٹیم کے درمیان بارہ گز کا فاصلہ ہونے کے ہماری ٹیم نے اسلامیہ کالج لاہور کی ٹیم کو ۴۰۰ میٹر کے اندر اندر بمپ کر لیا اور یونیورسٹی چیمپئن قرار پائی۔

مسلسل بارہ سال تک یونیورسٹی کی کشتی رانی کی دوڑ میں اول پوزیشن حاصل کرنے کے بعد تیرھویں سال ہماری ٹیم نے اسلامیہ کالج کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اس طرح تیرہ سال قبل جو ٹرافی اسلامیہ کالج لاہور سے ہم نے جیتی تھی واپس اسلامیہ کالج کو ہی پہنچ گئی۔ (کالج رپورٹ ۱۹۶۱-۶۲ء)

۲ سال کے بعد امسال ہم نے پھر وہی اعزاز حاصل کر لیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

ایک لمبا عرصہ مکرم و محترم چوہدری محمد علی صاحب اس ٹیم کے نگران رہے ہیں مگر اب چونکہ ان کی خدمات باسکٹ بال کلب کی طرف منتقل ہو گئی ہیں اس لئے ان کی جگہ محترم پرنسپل صاحب نے مکرم حمید احمد صاحب کو اس عہدہ پر مامور کیا ہے۔

باسکٹ بال:- تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں باسکٹ بال کی گیم کا آغاز ۱۹۵۶ء میں ایک کچی کورٹ پر کیا گیا ۱۹۵۸ء میں اسے پکا کر دیا گیا۔ ۲ سال بعد ۱۹۶۰ء میں ایک عدد مزید پکی کورٹ تعمیر کی گئی۔

۱۹۵۸ء میں پہلی دفعہ ہماری ٹیموں نے بورڈ اور یونیورسٹی چیمپئن شپ میں حصہ لیا۔ بورڈ ٹیم نے زونل ٹرافی جیتی جبکہ ڈگری ٹیم یونیورسٹی چیمپئن شپ کے لئے Runners up رہی۔ رفتہ رفتہ ہماری گیم کا معیار بلند ہوتا گیا۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء میں پہلی مرتبہ ہمارے کالج کے ۲ لڑکے انٹر یونیورسٹیز ٹورنامنٹ میں حصہ لینے والی پنجاب یونیورسٹی ٹیم میں Select ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں ہمارے کالج کے ۴ لڑکے "National Basket Ball meet" میں پنجاب کی نمائندگی کرنے والی ٹیم میں منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں پھر تین لڑکے پنجاب یونیورسٹی ٹیم کے لئے منتخب ہوئے۔[1]

---

[1] دیکھئے:- "4th All Pakistan Basketball Tournament 1962"

ہمارا کالج گزشتہ ۱۰ سال سے ہر سال ایک آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ منعقد کرتا ہے جس میں ملک کی نامور ٹیمیں شریک ہو کر نہایت ہی بلند پایہ اور معیاری کھیل کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

یہ ٹورنامنٹ تین Sections سکول، کالج اور کلب سیکشنز میں کھیلا جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں پہلا آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ منعقد ہوا جس میں شرکت کرنے والی ٹیموں میں سے وائی[1] ایم سی اے لاہور، برادرز کلب[2] لاہور، پنجاب پولیس[3]، ریلوے[4]، بمبئے سپورٹس کلب[5] کراچی، یونائیٹڈ کلب[6] لائلپور، ایگریکلچر کلب[7] لائلپور، ایس۔ ایس کالج[8] بہاولپور، گورنمنٹ کالج[9] و پی۔ اے۔ ایف[10] و فرینڈز کلب[11] سرگودہا کے نام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس ٹورنامنٹ میں کلب سیکشن کا فائنل میچ پولیس اور برادرز کلب کے درمیان ہوا۔ اول الذکر ٹیم فاتح رہی۔

تقریبِ تقسیم انعامات میں مہمانِ خصوصی مکرم و محترم چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب جج انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس دی ہیگ تھے۔

حال ہی میں کالج نے چھٹا آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ منعقد کیا۔ کلب سیکشن کا فائنل میچ پولیس اور پی۔ اے۔ ایف چکلالہ کے درمیان ہوا جسے پولیس نے ۴۴ کے مقابل پر ۴۸ پوائنٹس سے جیت لیا۔ کالج سیکشن کا فائنل میچ ٹی۔ آئی کالج اور ہیلے کالج کے درمیان ہوا۔ اول الذکر ٹیم فاتح رہی۔ سکول سیکشن میں فائنل میچ تعلیم الاسلام ہائی سکول اور گورنمنٹ ہائی سکول وحدت کالونی لاہور کے درمیان ہوا۔ مؤخر الذکر ٹیم نے صرف ایک پوائنٹ سے اول الذکر ٹیم کو شکست دی۔

پہلے سے چوتھے ٹورنامنٹ میں شریک ہونے والی ٹیموں کی تعداد بالترتیب ۱۲، ۲۱، ۲۹ اور ۱۸ رہی۔

فضل کالج کے زیرِ اہتمام گزشتہ تین سال سے آل ربوہ باسکٹ بال ٹورنامنٹ بھی منعقد کیا جا رہا ہے۔ آخری ٹورنامنٹ ۱۶ سے ۱۸ مئی ۱۹۶۲ء تک جاری رہا۔ اس میں ربوہ کی ۱۰ کے قریب ٹیموں نے حصہ لیا۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں کالج کی ٹیم کا انڈین وائی۔ ایم سی۔ اے باسکٹ بال ٹیم سے، جو اُن دنوں پاکستان کا دورہ کر رہی تھی، میچ ہوا۔ گو کالج کی ٹیم نو آموز طلباء پر مشتمل تھی اور اس کے بالمقابل مہمان ٹیم میں بہت سے نامور اور کہنہ مشق کھلاڑی شامل تھے، مقابلہ دونوں ٹیموں کے لئے جان توڑ ثابت ہوا[1]۔

نتیجہ جیسا کہ کھیل کے آغاز سے ہی نظر آ رہا تھا مہمان ٹیم کے حق میں نکلا اور وہ ۴۴ کے مقابلہ میں ۴۷ پوائنٹس سے جیت گئی۔

ربوہ میں باسکٹ بال کی اسی روز افزوں ترقی کی وجہ سے ہی اس کا شمار ملک میں باسکٹ بال کے تین چار اہم مراکز میں سے ہونے لگا ہے۔

اسی سلسلہ میں بعض امور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے الفضل ۷ر اکتوبر ۱۹۶۱ء +

(۱) گزشتہ سال، ان خدماتِ جلیلہ کی وجہ سے جو کالج اور اس کے قابلِ قدر پرنسپل نے باسکٹ بال کی ترقی و ترویج کے لئے سرانجام دی ہیں، محترم مرزا ناصر احمد صاحب کو سنٹرل امیچور باسکٹ بال ایسوسی ایشن کی انتظامیہ کمیٹی کی طرف سے ایسوسی ایشن کا صدر بنا دیا گیا۔

(۲) گزشتہ سال سے سالانہ ٹورنامنٹس کے موقع پر سنٹرل امیچور باسکٹ بال ایسوسی ایشن کی طرف سے ریفریز کے ایک مختصر سے ریفریشر کورس کا انعقاد بھی عمل میں لایا جاتا ہے۔

(۳) چند سال سے یہاں باسکٹ بال کوچنگ کیمپ بھی منعقد ہوتا ہے جس میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کو بہتر طور پر باسکٹ بال کھیلنا سکھایا جاتا ہے۔ نیز انہیں اس گیم کے قواعد و ضوابط سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے ـــــ آخری کوچنگ کیمپ اس سال یکم سے ۱۷ جون تک منعقد ہوا۔

(۴) ہمارے کالج کی ٹیمیں بورڈ و یونیورسٹی باسکٹ بال چیمپئن شپس کے مقابلوں میں شریک ہوتی ہیں اور متعدد دفعہ Trophies اور Champions ہونے کا اعزاز بھی حاصل کرتی رہی ہیں۔ اسی طرح باہر منعقد ہونے والے آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹس میں ہماری ٹیمیں شرکت کر کے انعامات حاصل کرتی رہی ہیں۔ گزشتہ سال ہمارے کالج کے ۶ طلباء بورڈ باسکٹ بال ٹیم میں اور ۲ طلباء پنجاب یونیورسٹی ٹیم میں منتخب ہوئے۔ وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

پہلے محترم خان نصیر احمد خان صاحب اس گیم کے نگران تھے مگر اب چونکہ وہ ڈاکٹریٹ کے لئے امریکہ و پاکستان تشریف لیجا چکے ہیں اس لئے یہ عہدہ محترم چوہدری محمد علی صاحب کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ کچھ عرصہ قریشی محمد اسلم صاحب ایم۔ ایس سی سابق لیکچرار کالج ہذا آپ کے نائب رہے ہیں۔ مکرم چوہدری صاحب سنٹرل باسکٹ بال ایسوسی ایشن کی مجلسِ عاملہ و منتخبہ کے رکن بھی ہیں۔ نیز مشرقی پاکستان میں منعقد ہونے والے اولمپک کھیلوں میں شمولیت کرنیوالی سنٹرل زون کی ٹیم کے مینیجر اور کوچ بھی رہے ہیں۔

ہائیکنگ، ماؤنٹینیرنگ اینڈ یوتھ ہاسٹلنگ کلب

یہ کالج کی قدیم ترین کلب ہے اور ملک کی معدودے چند اور فعال ترین کلبوں میں سے ایک ہے۔ اس کے صدر بھی محترم چوہدری محمد علی صاحب ہی ہیں۔

ان کے علاوہ

کالج کی ہاکی، فٹ بال، والی بال، کبڈی اور بیڈمنٹن کی بھی ٹیمیں ہیں۔ ان گیمز کے موجودہ انچارج صاحبان بالترتیب مکرم رشید غنی صاحب، مکرم رشید فوزی صاحب، مکرم چوہدری عطاء اللہ صاحب، مکرم چوہدری محمد شریف صاحب خالد

اور منوّر شمیم صاحب خالد ہیں۔

Physicaal Education کا بھی باقاعدہ مستقل شعبہ قائم ہے۔ جس کے ذمہ اور امور کے علاوہ سالانہ کھیلوں کا اہتمام کرنا بھی ہے۔ اس کے موجودہ انچارج مکرم محمد احمد صاحب انور حیدرآبادی ایم۔اے ڈی پی ای ہیں۔ ان سے پہلے مکرم ماسٹر محمد فضلداد صاحب اور مکرم چوہدری محفوظ الرحمٰن صاحب اس ڈیوٹی کو ادا کرتے رہے ہیں۔

بعض کلبز پہلے تھے مگر اب ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ان میں سے عسکری تربیت کا کلب خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

(دیکھئے کالج رپورٹس ۵۰-۱۹۴۹ء، ۵۱-۱۹۵۰ء، ۵۲-۱۹۵۱ء وغیرہ)

المنار

المنار ہمارا کالج میگزین ہے ——— ۱۹۵۰ء میں اس کی اشاعت کی اجازت ملی۔ چنانچہ اس کا پہلا پرچہ کالج کی پہلی کانووکیشن کے موقع پر ۲ اپریل ۵۰ء کو شائع کیا گیا۔

مختلف اوقات میں اس کے حصۂ انگریزی کے نگران مکرم چوہدری محمد علی صاحب، مکرم اخوند محمد عبدالقادر صاحب مرحوم، مکرم سعید احمد صاحب رحمانی اور مکرم مرزا خورشید احمد صاحب رہ چکے ہیں۔ موجودہ نگران مکرم چوہدری حمید احمد صاحب (لیکچرار ان انگلش) ہیں۔

حصۂ اُردو کے نگران مکرم فیض الرحمٰن صاحب فیضی، مکرم محبوب عالم صاحب خالد اور مکرم چوہدری محمد شریف صاحب خالد رہ چکے ہیں۔ اس حصہ کے موجودہ نگران مکرم شیخ محبوب عالم صاحب خالد ہیں۔

رسالہ کے سرپرست مکرم و محترم صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل کالج ہیں۔

کانووکیشنز

(College Convocations)

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی سب سے پہلی کانووکیشن ۲ر اپریل ۱۹۵۰ء کو ہوئی۔ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام جماعتِ احمدیہ نے خطبۂ اسناد ارشاد فرمایا ——— بعد کی کانووکیشنز کی تفصیل درج ذیل ہے:-

نمبر شمار	تاریخ انعقاد	مہمان خصوصی
۲	۴.۳.۵۱	خان بہادر ڈاکٹر محمد بشیر صاحب
۳	۳۰.۳.۵۲	جسٹس ایس۔اے رحمٰن، جج عدالتِ عالیہ مغربی پاکستان لاہور
۴	۲۱.۶.۵۴	چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب، سابق وزیر خارجہ پاکستان، جج عالمی عدالتِ انصاف ہیگ

نمبر شمار	تاریخِ انعقاد	مہمانِ خصوصی
۵	19.6.55	میاں افضل حسین صاحب، سابق V.C. پنجاب یونیورسٹی لاہور
۶	17.6.56	×
۷	10.3.57	سردار عبدالحمید دستی سابق وزیرِ تعلیم
۸	15.6.58	×
۹	14.6.59	قاضی محمد اسلم صاحب، سابق صدر شعبہ فلسفہ و نفسیات، کراچی یونیورسٹی
۱۰	7.5.60	جسٹس ایم۔ آر کیانی مرحوم، سابق چیف جسٹس مغربی پاکستان ہائیکورٹ۔ لاہور
۱۱	4.6.61	پروفیسر سراج الدین صاحب، سابق سیکرٹری صوبائی محکمہ تعلیم
۱۲	3.6.62	پروفیسر حمید احمد خان، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور
۱۳	9.6.63	مولانا صلاح الدین احمد مرحوم، سابق ایڈیٹر "ادبی دنیا" لاہور
۱۴	19.4.64	اس سال کنووکیشن کے موقع پر محترم حافظ سید مختار احمد صاحب شاہجہانپوری کا تحریر کردہ خطبۂ صدارت مکرم مولانا جلال الدین صاحب شمس نے پڑھ کر سنایا۔

نوٹ:۔ یاد رہے ۱۹۵۳ء میں بوجہ فسادات کنووکیشن منعقد نہ ہو سکی تھی۔

تعلیم الاسلام کالج

——— دوسروں کی نظر میں ———

(۱) ادیبِ شہیر مولانا صلاح الدین احمد مرحوم سابق ایڈیٹر "ادبی دنیا" لاہور نے گزشتہ سال کانووکیشن کے موقع پر کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"آپ کی ..... خوش بختی ..... ہے کہ آپ نے جس ادارے میں تعلیم و تربیت پائی ہے وہ دنیا میں دین کے امتزاج کا ایک نہایت متوازن تصور پیش کرتا ہے۔ نہ صرف پیش کرتا بلکہ اسے عملِ مسلسل میں ملبوس بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ہم اس کالج کو ایک معیاری، مکمل اور منفرد کلیہ کی حیثیت و صورت میں دیکھ سکیں اور کوئی وجہ نہیں کہ جہاں کام کو کام نہیں بلکہ ایک مشن تصور کیا جاتا ہے، جہاں طلباء کو فقط پڑھایا نہیں جاتا بلکہ ان کے مزاجوں میں ایک کوہ شکن سنجیدگی اور کردار

ہیں ایک شریفانہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے اور جہاں اساتذہ کی قربانیاں اور جانفشانیاں اپنے پیچھے ایک کہکشانِ نور چھوڑتی چلی جاتی ہیں وہاں اہلِ خیر کی تمنائیں کیوں نہ فروغ پائیں گی اور اہلِ علم کے عزائم کیوں نہ پورے ہوں گے۔"
(المنار، جلد ۱۳، شمارہ ۴)

(۲) کالج کی بزمِ اُردو کے سیشن ۶۳-۱۹۶۲ء کا افتتاح کرتے ہوئے جناب حماد رضا صاحب کمشنر سرگودہا ڈویژن نے روزنامہ الفضل کے الفاظ میں "تعلیم الاسلام کالج کی رفتارِ ترقی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے" فرمایا :-

"مَیں ابھی یہاں آیا ہوں اور یہاں آنے کے چند منٹ بعد مَیں نے آپ کے محبوب پرنسپل سے باتیں کی ہیں۔ مَیں مبارکباد دیتا ہوں اس کالج کے بانیوں کو کہ انہوں نے اس ادارے کو قائم کیا اور پھر اسے ترقی دیکر اس حد تک لائے اور اب اسے اَور ترقی دینے کے خواہاں ہیں۔ مجھے پرنسپل صاحب سے پتہ چلا ہے کہ ہر سال ہی کالج کے نتائج یونیورسٹی اور بورڈ کی شرح فیصد سے زیادہ رہتے ہیں۔ یہ امر واقعی باعثِ مسرت ہے۔ مَیں پرنسپل صاحب اور ان کے سٹاف کی خدمت میں دلی مبارکباد عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسے ادارہ کی سربراہی کا فرض ادا کر رہے ہیں جس پر وہ فخر کر سکتے ہیں۔ میری دعا ہے۔۔
۔۔۔۔ کہ آئندہ یہ کالج پہلے سے کہیں بڑھ کر ترقی کے منازل طے کرے۔"

(الفضل ۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۲ء)

(۳) سابق سیکرٹری محکمۂ تعلیم جناب انور عادل صاحب سی۔ایس۔پی، سیکرٹری صوبائی وزارتِ داخلہ نے ۱۹۶۲ء کے اوائل میں کالج یونین کے زیرِ اہتمام طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-

"بلاشبہ آپ کا تعلیمی ادارہ اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہے کہ اسے وہ ماحول میسر ہے جسے ہم صحیح معنوں میں تعلیمی ماحول کہتے ہیں۔ یہاں دھیان بٹانے اور توجہ ہٹانے والی بے مقصد قسم کی غیر علمی مصروفیات ناپید ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس خالص تعلیمی ماحول میں حصولِ تعلیم اور کردار سازی کے نقطۂ نگاہ سے آپ کو یہاں ایک بھرپور زندگی بسر کرنے کا زرّیں موقع حاصل ہے اور آپ لوگ سیرت و کردار کے یکساں سانچوں میں ڈھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔" (کالج رپورٹ ۶۲-۱۹۶۱ء)

(۴) جسٹس سجاد احمد جان، جج عدالتِ عالیہ مغربی پاکستان، لاہور نے مورخہ ۵ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو "کامیاب زندگی کے اصول" کے موضوع پر طلباء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-

"یہاں آنے کے بعد محترم پرنسپل صاحب سے مجھے تعلیم الاسلام کالج کے بعض کوائف کا پتہ چلا ہے پرنسپل صاحب نے گفتگو کے دوران مجھے بتایا کہ یہ ایک غریب ادارہ ہے لیکن ساتھ ہی جب انہوں نے

یہ بتایا کہ ہمارے ہاں ڈسپلن کس درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہے اور یہ کہ ہماری لیبارٹریز پنجاب کی بہترین لیبارٹریز میں شمار ہوتی ہیں تو میں نے سوچا کہ یہ غربت تو دوسرے کالجوں کی تونگری سے بدرجہا بہتر ہے۔

اس ادارہ میں تربیت کی کشتی کے چپو بڑے ہی پختہ کار ہاتھوں میں ہیں جو جانتے ہیں کہ ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے بالآخر ماحول پر کس طرح غلبہ پایا جا سکتا ہے۔ یہ بجائے خود بہت بڑی خوبی پر دلالت کرتا ہے۔" (الفضل ۸ر دسمبر ۱۹۶۲ء)

(۵) میاں افضل حسین صاحب نے، جو اُن دنوں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، ۱۹۵۵ء میں کالج کنووکیشن کے موقع پر طلباء سے خطاب کرتے ہوئے "الفضل" کے الفاظ میں

"اس امر پر اظہارِ مسرت فرمایا کہ تعلیم الاسلام کالج ہر لحاظ سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور اس کے ساتھ ہی اساتذہ کالج کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔"

(۶) جناب زیڈ۔ اے ہاشمی .V.C زرعی یونیورسٹی لائلپور نے بزم اُردو ۶۴-۱۹۶۳ء کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا:۔

"تعلیم الاسلام کالج ملک کا وہ **ممتاز ترین ادارہ** ہے جہاں کے طلباء کا اوڑھنا بچھونا علم ہے اور وہ علم کے حصول کو بھی ایک عبادت تصور کرتے ہیں۔" (الفضل ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۳ء)

(۷) جسٹس انوار الحق صاحب، جج ہائی کورٹ مغربی پاکستان لاہور نے ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو "قومی تعمیر میں طلبہ کا حصہ" کے موضوع پر طلباء کے سامنے تقریر کی۔ تقریر کے آغاز میں آپ نے

"کالج کے جملہ نظام اور طلبہ کی تنظیم و تربیت پر مسرت کا اظہار فرمایا اور کہا کہ آج آپ کے ادارہ میں آکر میری اپنی طالب علمی کا دور میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ **آکسفورڈ جیسی فضا دیکھ کر** میرے دل میں پُرانی یادیں تازہ ہو گئی ہیں اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو **مثالی تعلیمی اور تربیتی ماحول** میسر ہے جہاں دوسری جگہوں کی مضرت انگیز مصروفیات ناپید ہیں۔" (الفضل ۱۴ر دسمبر ۱۹۶۲ء)

(۸) پروفیسر حمید احمد خان صاحب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۶۲ء میں کالج کنووکیشن سے خطاب کرتے ہوئے کالج کے متعلق فرمایا:۔

"یہ کالج دوسری غیر سرکاری درسگاہوں کی طرح ہمارے قومی نظامِ تعلیم میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ مجھے اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ قومی جماعتوں اور انجمنوں کی قائم کی ہوئی درسگاہیں اپنی خامیوں

اور کمزوریوں کے باوجود ہماری اجتماعی زندگی میں ایک بنیادی ضرورت کو پورا کر رہی ہیں اور اُن کے نہ ہونے سے ہماری زندگی میں ایک خلا ہوگا۔" (کنووکیشن ایڈریس)

(۹) محکمۂ تعلیم کے سابق صوبائی سیکرٹری مکرم پروفیسر سراج الدین صاحب سلمہٗ میں کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت کے لئے تشریف لائے۔ اُنہوں نے اپنے صدارتی ارشادات میں تعلیم الاسلام کالج اور اس کے منتظمین کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:۔

"خالصتاً ذاتی عزم و کوشش کے نتیجہ میں تعلیم الاسلام کالج جیسی درسگاہ قائم کر دکھانا اور پھر اسے پروان چڑھا کر اس کے موجودہ معیار پر لانا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے ..... ہر چند مجھے پہلی بار تعلیم الاسلام کالج کی حدود میں قدم رکھنے کا اتفاق ہوا ہے تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میرے دل میں ..... محبت کا ایک خاص مقام ہے ..... جب میں اس کالج پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے انگلستان اور امریکہ میں علم کی ترویج اور اس کے فروغ کے متعلق انسانوں کے وہ عظیم محسن یاد آئے بغیر نہیں رہتے جنہوں نے خدا کی تقدیس اور بنی نوع انسان کی خدمت کی نیت سے کیمبرج اور ہاورڈ میں کالج قائم کئے۔ خالصتاً ذاتی عزم و ہمت کے بل بوتے پر ربوہ میں ایسی درسگاہ قائم کر دکھانا ایک عظیم کارنامہ ہے اور پھر اس کی آبیاری کرنا اور پروان چڑھا کر اُسے حُسن و خوبی اور مضبوطی اور استحکام سے مالا مال کر دکھانا اور بھی زیادہ قابلِ ستائش ہے۔" (دیکھئے المنار جلد ۱۲ شمارہ ۲/۳)

○

ایک سرکاری افسر کو پہلی بار مشاعرے کی صدارت کے فرائض انجام دینے پڑے۔ مشاعرے کا آغاز ایک خوش گلو شاعر سے ہوا۔ ابھی شاعر نے مطلع ہی پڑھا تھا کہ سامعین جوش و خروش سے چیخے "مکرّر"، "مکرّر" صدر مشاعرہ نے تعجب سے سیکرٹری کو دیکھتے ہوئے سوال کیا:۔

"مکرّر کا کیا مطلب ہے سیکرٹری صاحب!"

"سامعین اس شعر کو پھر سُننا چاہتے ہیں" سیکرٹری نے مسکرا کر جواب دیا۔ لیکن سیکرٹری کا جواب سُنتے ہی صاحبِ صدر مائیکروفون پر زور سے چیخے:۔

"حضرات! میں یہاں مکرّر نہیں چلنے دوں گا۔ آپ پہلی ہی بار شاعر کی بات غور سے سُننے کی کوشش کریں، آپ شاعر کو بلاوجہ پریشان کیوں کرتے ہیں"

عبد السبحان سبحانی
- اولڈ سٹوڈنٹ

ٹیلی ویژن ـــــ ایک جدید سائنسی ایجاد

ہم ترقی کے اس دور سے گزر رہے ہیں جہاں سائنس کے کرشموں کا بسیرا ہے اور ناممکن کا لفظ قریباً ناپید ہے۔ اگر ہم ماضی کی طرف نظر پھیر کر دیکھیں تو سوائے اندھیرے کے اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ایک صدی پیشتر ہی کا جائزہ ہمیں یہ بتائے گا کہ وہ ایجادات جو اس وقت ہو چکی ہیں اُس پچھلی صدی میں اِن کے متعلق کچھ بھی سوچا نہیں جا سکتا تھا اور اِن کی حیثیت بہ دیکھتے ایک سنہرے خواب سے زیادہ نہ تھی۔ جتنی سرعت کے ساتھ سائنس نے ترقی کی ہے اس کو تو ہر شخص جانتا ہے اور بخوبی واقف ہے۔ اگر ہم ایٹم ہی کی مثال سامنے رکھ کر ماضی میں کھو جائیں تو عجب کیفیت پیدا ہوتی ہے کہیں یہ ایک نہ نظر آنے والا ذرّہ دنیا کو ہمیشہ کی نیند سُلا سکتا ہے؟ یقیناً اُس وقت اِس کا جواب نفی میں ہوتا اور یہ بات کہنے والا ایک سائنسدان تو نہیں البتہ ایک دیوانے اور پاگل کا خطاب ضرور پاتا۔ آج کی دنیا میں بچہ بچہ ایٹم کی اہمیت کو سمجھ چکا ہے اور سب لوگ جانتے ہیں کہ ایٹم دنیا کی ہر رنگ میں خدمت بھی بجا لا سکتا ہے اور یقیناً کر رہا ہے۔ اسی طرح چند سو سال قبل لوگ گدھوں، اونٹوں اور گھوڑوں پر ہزاروں میل کا سفر مہینوں کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد طے کرتے تھے، اُن کو کسی بھی لمحہ اپنی زندگی اور مال کا بھروسہ نہ تھا۔ لیکن آج ہم بے خوف و خطر ان مہینوں کو دنوں اور گھنٹوں میں تبدیل کر کے ہوائی سفر کے مزے لے رہے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی دی ہوئی عقل کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان نے ہر مشکل پر قابو پا لیا اور ابھی مزید خزانوں کو حاصل کرنے کے لئے دن رات کوشاں ہے۔

ہم آج کے مضمون میں انسان کی ذہنی صلاحیتوں سے حاصل شدہ بیسویں صدی کی ایک حیرت انگیز ایجاد کا ذکر کر رہے ہیں جس کا نام ٹیلی ویژن ہے۔ موجودہ دور میں اِس ایجاد سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔ جو دنیا کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کرے گی اور ہم ایک نیا سفر نئی امنگوں کے ساتھ شروع کریں گے۔

اگر ہم ٹیلی ویژن کے لفظی معنوں پر غور کریں تو اس لفظ کے دو حصے ہیں۔ ایک ٹیلی جس کا مطلب ہوتا ہے دُور سے، اور ویژن کے معنے دیکھنے کے ہوتے ہیں۔ گویا ٹیلی ویژن سے مراد "دُور سے دیکھنا" ہوتا ہے لیکن شاید آپ یہ پڑھ کر چونک جائیں کہ دُور سے دیکھنے والے آلے کا نام تو دُوربین ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ سو فیصد درست ہے مگر دُور سے دیکھنا بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو چند میلوں تک بذریعہ دُوربین دیکھنا لیکن دیکھنے والے اور اُس جسم کے درمیان بھی کو

دیکھنا مقصود ہو کوئی اور وسیلہ سوائے ہوا کے حائل نہ ہو۔ دوسری قسم ٹیلی ویژن سے تعلق رکھتی ہے جو ہزاروں میل دور اشیاء کے دیکھنے میں مدد دیتا ہے چاہے وہ چیز دنیا کے کسی کونے میں چھپی ہوئی ہو۔ جب ٹیلی ویژن کیمرہ اس چیز پر سیٹ کر دیا جائے تو وہ چیز ایک وقت میں ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کی نظر سے بذریعہ ٹیلی ویژن گزر جائے گی۔ جہاں تک دوربین جیسے آلے کا تعلق ہے یہ نہایت ہی سادہ ہوتا ہے۔ دو یا تین محدب عدسوں وغیرہ پر مشتمل دوربین دور سے دیکھنے کا کام سرانجام دیتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ٹیلی ویژن ایک نہایت ہی پیچیدہ آلہ ہوتا ہے۔

ٹیلی ویژن کا موجد

سب سے پہلے ایک یونانی سائنسدان کے دماغ میں یہ بات مسلط ہوئی کہ اگر آواز کو برقی لہروں میں تبدیل کر کے دور دراز علاقوں میں بذریعہ ریڈیو سنا جا سکتا ہے تو کیوں تصاویر پر یہ عمل نہیں ہو سکتا؟ یقیناً ہم تصاویر کو روشنی کے نقاط میں تحلیل کر کے برقی لہریں پیدا کر سکتے ہیں اور پھر ایک خاص مشین کے ذریعہ ان پیدا شدہ لہروں سے تصاویر حاصل کر سکتے ہیں۔

اگرچہ یہ معاملہ بڑا دقت طلب تھا کہ کس طرح کسی جسم کو برقی لہروں میں تبدیل کر کے ان کو دوبارہ حاصل کیا جا سکے لیکن پال نپ کو (Paul Nipkow) ان تمام مشکلات پر قابو پانے کے فکر میں غرق ہو رہا تھا۔ پال نے دن رات ایک کر کے آخرکار دو مشینیں ایسی تیار کر لیں کہ جن کی مدد سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکا۔ اگرچہ پال کے ٹیلی ویژن سیٹ اور آج کے جدید سیٹوں میں کافی فرق ہے لیکن اصول پال ہی کا استعمال ہوتا ہے۔ جن دنوں پال نے اپنا سیٹ تیار کر کے تجربہ گاہ میں نصب کر دیا تھا۔ اس کے تجربات کے پہلے دن اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

اسے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس کے تجربہ میں شامل ہو اور کیمرہ کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے آپ پر تجربہ کرائے لیکن بڑی مشکل سے اس کی نظر ایک ملازم تک پہنچی جو شاید اپنے آپ کو اس امر کے لئے پیش کر سکے۔ ملازم کو لیبارٹری میں لایا اور اس سے یہ کہا کہ تم صرف کیمرہ کے سامنے کھڑے ہو جاؤ تاکہ تمہاری تصویر ٹیلی ویژن سیٹ پر دیکھی جا سکے۔ وہ رضامند ہو گیا۔ لیکن بلبوں کی چندھیا دینے والی روشنی سے ڈر بھی گیا۔ پال نے اس کو سمجھایا بجھایا اور آخرکار چند پونڈ دینے کا وعدہ بھی کیا۔ چنانچہ وہ ٹیلیفون کیمرہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پال دوسرے کمرہ میں پہنچا اور ٹیلی ویژن سیٹ کو چلا کر بہتیرا بٹنوں کو ادھر ادھر گھمایا مگر سوائے ایک سفید روشنی کے سکرین پر کچھ بھی نظر نہ آ سکا۔ بیچارہ پال بڑا دل برداشتہ ہوا اور واپس کیمرہ والے کمرہ میں پہنچا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کی کچھ ڈھارس بندھی کہ وہ نوکر کیمرہ کے سامنے سے ہٹ کر کھڑا تھا اور پسینہ میں شرابور تھا کیونکہ کیمرہ کے سامنے جو بلب لگے ہوتے تھے وہ بڑی طاقت کے تھے اور ان سے کافی گرمی پیدا ہو رہی تھی۔ پال نے دوبارہ اس کو تسلی تشفی دی اور کہا کہ ایک منٹ ہی کی تو بات ہے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور پھر پال فوراً ٹیلی ویژن سیٹ کے کمرہ کی طرف لپکا۔ اس مرتبہ اسے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ نوکر کا دھندلا سا فوٹو سکرین

اب ہم ٹیلی ویژن کی اس پلیٹ کی طرف دوبارہ لوٹتے ہیں جس پر سلور سیشیم دھاتوں کی گولیاں ہیں۔ عام حالات میں تمام دھاتیں بے بار (Neutral) ہوتی ہیں لیکن سیشیم دھات کی یہ خصوصیت ہے کہ جب اس پر روشنی پڑ رہی ہو تو یہ فوراً روشنی کی مقدار کے موافق منفی برقی بار (Electron) چھوڑنا شروع کر دیتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں دھات مثبت طور پر برقائی جاتی ہے۔ جتنی زیادہ روشنی دھات پر مرتکز ہوگی اتنے ہی زیادہ الیکٹرون دھات سے فرار ہو کر دھات کی سطح کو الیکٹرون کی تعداد کے برابر مثبت برقی بار دیدے گی۔ گویا مثبت برقی بار اس سطح پر مقید ہو گیا۔ لیکن جب ہم اس سطح کو دائر مقدار میں الیکٹرون سپلائی کریں گے تو وہ سطح اتنے ہی الیکٹرون جذب کر لے گی جتنے پہلے اس سطح کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس طرح ہم سیشیم دھات کو بار بار برقا بھی سکتے ہیں اور بے بار بھی کر سکتے ہیں۔ اسی لیے سیشیم دھات کو اس پلیٹ میں جو کیمرہ میں نصب ہوتی ہے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

جب کسی جسم کا عکس اس پلیٹ پر پڑتا ہے تو عکس کی نوعیت کے مطابق ہر گولی سے اس کے حسب حال الیکٹرون خارج ہو کر ہر گولی پر مختلف طاقت کا برقی بار چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد ہم ایک منبع سے الیکٹرون کو ایک قطار میں لا کر ایسا انتظام کرتے ہیں کہ یہ الیکٹرون باری باری ہر گولی پر یکے بعد دیگرے گرتے ہیں اور ان گولیوں کو الیکٹرون سپلائی کرتے ہیں۔ اس منبع کا نام الیکٹرون گن (Electron Gun) ہوتا ہے۔ ان گولیوں پر مثبت برقی بار مقید ہونے کی وجہ سے پلیٹ کی پشت پر نصب شدہ دھاتی پترے پر منفی برقی بار اتنی ہی مقدار میں مقید ہو جاتا ہے جتنا کہ گولی کی سطح پر مثبت بار۔ لیکن جب گولیوں کو باری باری الیکٹرون کی سپلائی بذریعہ ایک الیکٹرون گن کی جاتی ہے تو پترے پر مقید منفی بار آزاد ہو کر تار کے ذریعہ ٹرانسمیٹر میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح یہ عمل ہر گولی پر کیا جاتا ہے اور ہر گولی اسی طرح الیکٹرون کو دھاتی پترے سے آزاد کرتی رہتی ہے جس سے الیکٹرون متواتر بہنے لگتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر گولی سے ایک ہی تعداد میں الیکٹرون خارج نہیں ہوتے اس لیے یہ الیکٹرون بھی کم و بیش ہوتے رہتے ہیں۔

آپ کو یہ علم ہو گا کہ تاروں میں برقی رو چلنے کی وجہ الیکٹرون کا چلنا ہوتا ہے۔ جتنے زیادہ الیکٹرون تار میں دوڑ رہے ہوں گے اتنی ہی طاقتور برقی رو تار میں سے گزر رہی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ پترے سے حاصل شدہ الیکٹرون سے ایسی برقی رو پیدا ہو جاتی ہے جو طاقت میں کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ آخر میں اس حاصل شدہ بدلنے والی برقی رو کو ٹرانسمیٹر کے ذریعہ طاقتور (Amplify) کیا جاتا ہے اور ایریل کے ذریعہ ہوا میں الیکٹرومیگنیٹک (Electromagnetic) لہریں چھوڑی جاتی ہیں جو ٹیلی ویژن سیٹ میں پہنچ کر دوبارہ تصاویر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

اب ہم ٹیلی ویژن سیٹ کا ہلکا سا تصور پیش کرتے ہیں کہ یہ کس طرح پر تصاویر حاصل کرتا ہے۔

ٹیلی ویژن سیٹ میں بھی بنیادی اصول وہی ہیں جو کیمرہ میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرز کی الیکٹرون گن ویسا ہی

ایک ہوا خارج شدہ بلب ۔ الیکٹرون گن کی رفتار بھی بالکل کیمرہ سے مطابقت رکھتی ہے لیکن یہاں پلیٹ کی بجائے ایک ایسی سکرین استعمال کی جاتی ہے جو جست اور کیڈمیم دو دھاتوں کے نمکیات سے بنی ہوئی ہوتی ہے۔ ان نمکیات کے ملنے سے ایک ایسی پلیٹ بنتی ہے کہ جس پر جب الیکٹرون گرائے جاتے ہیں تو اُن الیکٹرون کی بدولت روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ نمکیات ان دھاتوں کے سلفیٹ (Sulphate) کی شکل میں ہوتے ہیں اور ان کو Phosphor Bronze کہا جاتا ہے۔

ابتدا میں یہ فاسفورس برونز الیکٹرون کے ثبوت کے لئے استعمال کی گئی تھی جس کے بعد اس کو ٹیلی ویژن سکرین میں نمایاں مقام حاصل ہوا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ جب الیکٹرون اس پر گرتے ہیں تو وہاں روشنی پیدا ہوتی ہے اور سکرین وہاں سے چمکنے لگتی ہے۔ جیسے ہی الیکٹرون کو سکرین پر گرانا بند کر دیا جائے۔ روشنی بھی بند ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب کسی حصہ پر زیادہ الیکٹرون گریں گے تو وہ حصہ زیادہ روشن ہو جائے گا۔

ٹیلی ویژن سیٹ ریڈیو کی طرح ایریل سے سگنل وصول کرتا ہے۔ ان وصول شدہ سگنلوں کو الیکٹرون میں دوبارہ حاصل کیا جاتا ہے۔ چونکہ سگنل کی طاقت کم و بیش ہوتی رہتی ہے جو کہ سٹیشن سے نشر کئے جاتے ہیں اس لئے الیکٹرون کی حاصل شدہ تعداد میں بھی فرق پڑتا رہتا ہے۔ ان حاصل شدہ الیکٹرون کو الیکٹرون گن کی مدد سے سکرین پر مرتکز کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں پر الیکٹرون گن بجائے اُوپر بائیں طرف سے سفر شروع کرنے کے اس کے مخالف یعنی نیچے دائیں طرف سے سفر شروع کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کیمرہ میں عدسہ سے عکس اُلٹا حاصل ہوتا ہے۔ اگر الیکٹرون گن کی وہی چال یہاں پر رکھی جائے تو ٹیلی ویژن سیٹ میں بھی عکس اُلٹا بنے گا۔ اسی لئے یہاں سمت وغیرہ بدل دی جاتی ہے لیکن رفتار قطعاً نہیں بدلی جاتی۔

جیسا سگنل ٹیلی ویژن سٹیشن سے بھیجا جا رہا ہوگا ویسا ہی سیٹ وصول کر کے اس کو دو حصوں میں تقسیم کریگا۔ ایک آواز کا سگنل اور دوسرا تصویر کا حصہ۔ دونوں حصے اپنے اپنے مقام پر پہنچ جائیں گے اور آواز اور تصویر دونوں بیک وقت پیدا ہوں گے۔ ٹیلی ویژن سیٹ میں نصب شدہ سکرین پر تصویر بنے گی اور لاؤڈ سپیکر سے وہی آواز پیدا ہوگی جو سٹیشن پر پیدا کی جا رہی ہو۔ جتنے الیکٹرون ٹیلی ویژن سٹیشن سے کیمرہ چھوڑ رہا ہوگا اتنے ہی الیکٹرون ٹیلی ویژن سیٹ سے سکرین پر گر رہے ہوں گے۔ اسی طرح یہ الیکٹرون تصاویر سکرین پر بناتے جائیں گے اور ہم ان کو بخوبی دیکھ سکیں گے۔

ٹیلی ویژن سیٹ کی سکرین ۴ : ۳ کی ہوتی ہے یعنی چوڑائی ۴ اور اونچائی ۳ حصے۔ اس سکرین کے باہر کی جانب جہاں ہم تصاویر دیکھتے ہیں ایک شیشہ فاسفور برونز سکرین کو محفوظ کرنے کے لئے رکھا ہوتا ہے اور فاسفور برونز کی موٹائی اتنی رکھی جاتی ہے کہ نہ تو الیکٹرون اس کی موٹائی کو پھاڑ کر گزر سکیں اور نہ ہی اتنی

ہوتی کہ تصویر ہی نظر نہ آئے۔

یہ بتا دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ الیکٹرون گن کی رفتار اتنی ہوتی ہے کہ وہ ایک سیکنڈ میں پلیٹ کو تیس مرتبہ طے کرتی ہے اور ہر دھاتی گولی پر سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس طرح اس گن کو ایک سیکنڈ میں ۳۰ × ۳۶۷,۵۰۰ = ۱۰۰۲,۵۰۰ نقاط یا وہ دھاتی گولیاں طے کرنی پڑتی ہیں جو سلور سیشیم کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

ٹیلی ویژن کی لہریں ہر چیز سے خواہ وہ موصل ہو یا غیر موصل ٹکرا کر واپس لوٹتی ہیں یعنی منعکس ہو جاتی ہیں۔ یہ بات سائنسدانوں نے کافی تجربات کے بعد معلوم کی۔ اس ضمن میں مختلف تجربات بھی کیے کہ ٹیلی ویژن کی لہروں کو دُور دُور مقامات تک کیسے پہنچایا جا سکتا ہے۔ امریکہ نے ایک سیارہ (Telestar I) ٹیل سٹار اوّل کے نام سے فضا میں بلند کیا جو کافی بلندی پر جا کر پھٹ گیا۔ جس کے پھٹنے سے ایسا مادہ کرۂ ہوائی میں پھیل گیا کہ جو ٹیلی ویژن کی لہروں کو منعکس کر سکتا تھا۔ اس سیارہ سے امریکہ کے اندر ٹیلی ویژن سیٹ استعمال کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔ ایک اور سیارہ (Telestar II) ٹیل سٹار دوم یورپ اور امریکہ میں ٹیلی ویژن کا رابطہ قائم کرنے کے لئے کرۂ ہوائی میں بلندی پر پھینکا گیا جس سے تقریباً ۲۰۰۰ میل تک ٹیلی ویژن سیٹ کام کرنے لگے ہیں۔

ٹیلی ویژن کی لہروں کی کمزوری کے باعث ایریل نہایت اونچا ہونا چاہیئے۔ تاکہ دُور دُور علاقوں میں پروگرام دیکھا جا سکے۔ سائنسدانوں نے ایک ایسا فارمولا تیار کر لیا جس نے یہ ثابت کیا کہ کتنی دُور تک کوئی ٹیلی ویژن کام دے سکتا ہے۔ اس فارمولا سے ایریل کی بلندی کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ $d = 1.23\sqrt{ht}$ یہاں d سے مراد میلوں میں ٹیلی ویژن سٹیشن کا فاصلہ اور ht سے مراد ٹیلی ویژن سٹیشن پر نصب شدہ ایریل کی فٹوں میں اونچائی۔ اگر ایریل کی اونچائی ۴۰ فٹ ہو تو صرف ۱۰ میل تک ٹیلی ویژن پروگرام دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ۱۰۰۰ فٹ ایریل کی بلندی ۱۲۵ میل کی دُوری تک ٹیلی ویژن کی لہروں کو پھینک سکتی ہے۔

یہ تو ابتدائی مراحل تھے جن میں سے ٹیلی ویژن کو گزرنا پڑا۔ موجودہ دور میں نہ صرف کئی اور ترقیاں حاصل ہوئی ہیں بلکہ مزید باتوں پر غور ہو رہا ہے۔ جیسے سینما میں رنگین فلمیں دکھائی گئیں اسی طرح سائنسدانوں نے یہ کٹھن مرحلہ بھی طے کر لیا اور رنگین ٹیلی ویژن ایجاد ہوا۔ بنیادی طور پر اصول تو وہی اپنائے گئے ہیں لیکن فرق صرف الیکٹرون گن میں ڈالا گیا ہے۔ رنگین ٹیلی ویژن سیٹوں میں ایک کی بجائے تین الیکٹرون گن استعمال کی جاتی ہیں۔ سُرخ، سبز اور نیلے رنگوں کی حامل ان الیکٹرون گنوں کی بدولت رنگدار تصاویر سکرین پر ظاہر ہوتی ہیں۔ اب تو رنگین کے ساتھ ساتھ ایسے ٹیلی ویژن بنانے کی کوشش زور دل پر ہے جس کے ذریعہ قدرتی نظارہ کو پوری طرح ظاہر کیا جا سکے اور دیکھنے والا یہ محسوس کرے کہ وہ ٹیلی ویژن نہیں بلکہ حقیقی چیزیں دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں ایک سینما ایسا بھی ہے جہاں نہ صرف رنگین فلمیں ہی دیکھی جا سکتی ہیں بلکہ پردۂ سیمیں کے ماحول کو پوری طرح قدرتی بنانے کے لئے ہال میں بیٹھے ہوئے تماشائی

خوشبو اور بُو کو بھی پُوری طرح محسوس کرتے ہیں۔ اگرچہ جو طریقہ کار استعمال میں ہے وہ بہت دقّت طلب ہے تاہم مزید ترقی کے راستوں کی تلاش جاری ہے۔ وہاں پر خوشبو اور بُو کو تماشائیوں تک پہنچانے کے لئے یوں انتظام ہے کہ اسی (۸۰) مختلف خوشبوئیں وغیرہ سیلنڈروں میں بند ہوتی ہیں۔ اب یہ آپریٹر کی ڈیوٹی ہوتی ہے کہ جیسا ماحول سکرین پر ظاہر ہو رہا ہو۔ اس کے مطابق وہ سینما کی فضاء بھی بدلتا رہے۔ مثلاً اگر سکرین پر ایک باغ دکھایا جا رہا ہے۔ جہاں گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں تو آپریٹر خوشبو کے اس سیلنڈر کو کھول دے گا جس میں گلاب کی خوشبو کے لئے انتظام ہے۔ یہ خوشبو چند سیکنڈ میں پنکھوں کے ذریعہ ہال میں پھیلا دی جائے گی اور دوسری ہَوا کو پنکھوں کے ذریعہ باہر کھینچ لیا جاتا ہے۔ اِس طرح تماشائی مکمّل طور پر ہر چیز سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔

اب ٹیلی ویژن کو بُو اور خوشبو سے لیس کرنے کا تجربہ بھی جاری ہے لیکن اس میں آپریٹر کی طرح کنٹرول کرنے کا طریقہ نہیں بلکہ خودکار کنٹرول کا مکمّل انتظام رکھا جائے گا۔

دنیا کی گہما گہمی اور تیز دوڑ میں انسان کو سب حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ ریڈیو کی ایجاد نے دنیا کو آواز کے ذریعہ ملا دیا۔ لیکن اب تو ٹیلی ویژن نے ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو ہزاروں میل دُور بھی ایسے ہی دیکھ سکتا ہے، گویا وہ سامنے ہی کھڑا ہو۔ اسی طرح اپنے ملک کے محبوب لیڈروں کو ان کی کارکردگی میں ہم ہر وقت دیکھ سکیں گے۔ نہ صرف ان کی تقریروں کے الفاظ سُن سکیں گے بلکہ انہیں اپنے سامنے تقریر کرتے ہوئے دیکھیں گے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ کھیلوں سے گھر بیٹھے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں گے۔ سب سے بڑھ کر ٹیلی ویژن ذریعۂ تعلیم میں مدد دے گا۔ بعض اہم آپریشنوں میں ڈاکٹر اور چند طلباء ہی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ٹیلی ویژن سے ہزاروں ڈاکٹر اور طلباء مستفید ہوں گے۔ غرضیکہ دنیا کے ہر شعبہ میں ٹیلی ویژن کو ایک نمایاں مقام حاصل ہو جائے گا۔

"ایک روز قبرستان سے میرا گزر ہوا۔ ایک قبر بہت پسند آئی۔ اس کے قریب گیا اور سرِ مزار کھڑا ہو کر قبر کے ثبات اور عالم کی بے ثباتی پر غور کرنے لگا۔ معاً نظر لوحِ تربت پر پڑی۔ لکھا تھا "شیخ چلّی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار"۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ہاتھ بے اختیار فاتحہ پڑھنے کو اُٹھے۔ آہ! شیخ چلّی برِّ صغیر کا سب سے بڑا مفکّر۔ تُو ہمارے یہاں سے کیا گیا خیالی پلاؤ پکانے کا سلسلہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ پلاؤ پہلے ہی ہمارے یہاں کم ملتا تھا مگر اب خیالی پلاؤ سے بھی محروم ہو گئے۔" (شیشہ و تیشہ۔ کنہیا لال کپور)

محمود احمد
سال دوم (فنون)

تمباکو نوشی

کہتے ہیں کہ ایک شخص سر والٹر ریلف نے سب سے پہلے تمباکو پیا۔ یہ بڑے مزے سے کش لگا رہا تھا کہ اُس کے نوکر نے اُس کے مُنہ سے دھواں نکلتا دیکھا تو سمجھا کہ شاید میرے مالک کو آگ لگ گئی ہے۔ چنانچہ وہ ایک پانی کی بھری ہوئی بالٹی لے آیا اور اپنے مالک کے سر پہ ڈال دی۔ دیکھنے والے اس منظر کو دیکھ کر بہت ہی ہنسے اور انہوں نے بھی مذاقاً تمباکو نوشی شروع کر دی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بُری عادت "انسانی بھیڑ چال" کا نتیجہ ہے۔

برطانیہ میں ہر سال کئی کروڑ پونڈ رقم تمباکو نوشی پر ضائع کر دی جاتی ہے۔ یہ اس قوم کا حال ہے جس کا شمار دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں ہوتا ہے اور اب تو پاکستان میں بھی تمباکو پینے کا رواج دن بدن زیادہ ہو رہا ہے۔ اسی حساب سے تمباکو کی کاشت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے تمباکو کی قیمت اٹھارہ کروڑ نوّے لاکھ پونڈ ہے۔ کُل پیداوار کا پچّن فیصد مشرقی پاکستان میں، سترہ فیصد پنجاب میں اور ۲۳ فیصد سرحد میں ہوتا ہے۔ پاکستان میں تمباکو کو حُقّہ، بیڑی اور سگریٹ میں پیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پان میں بھی کھایا جاتا ہے۔ پاکستان میں بڑے بڑے امیروں اور رئیسوں کے گھروں میں تمباکو پلینا تفریح کا سامان سمجھا جاتا ہے۔ حُقّہ نوشی مزدور پیشہ لوگوں کا بھی عام مشغلہ ہے۔ دو وقت کی روٹی بے شک نہ ملے مگر حُقّہ ضروری ہے ——!

تمباکو نوشی سے بہت سی بیماریاں جنم لیتی ہیں :-

- تمباکو جب جلتا ہے تو اس کے دھوئیں سے کاربانک ایسڈ گیس اور ایک نہایت ہی زہریلا تیزاب نکلتا ہے جو اتنا مہلک ہوتا ہے کہ اگر اس کی ایک بُوند سانپ کی زبان پر ڈال دی جائے تو وہ فوراً ہلاک ہو جائے۔
- تمباکو جب جلتا ہے تو ایک قسم کی کھار بھی پیدا ہوتی ہے جو اِس قدر زہریلی ہوتی ہے کہ اگر رتّی بھر کھار ایک تندرست کُتّے کو کھلا دیں تو وہ ہمیشہ کی نیند سو جائے۔
- تمباکو نوشی سے ہمیشہ سر چکراتا رہتا ہے، مُنہ خشک رہتا ہے، دل انجن کی طرح آواز دیتا رہتا ہے جیسے اس میں آگ لگ گئی ہو۔ جسم کمزور و ناتوان اور ڈھیلا ہو جاتا ہے، چہرے پر مُردنی سی چھا جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دماغ، بینائی، پھیپھڑے، دل اور جگر کمزور ہو جاتے ہیں، قوّتِ ارادی میں ضعف آجاتا ہے۔ اکثر تمباکو پینے سے تپ محرقہ بھی ہو جاتا ہے۔ نوّے فیصد آدمیوں کو دل کی دھڑکن کی بیماری تمباکو پینے کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے۔

ایک ڈاکٹر کا قول ہے کہ "تمباکو پینے کی مضر عادت ڈالنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنا گلا گھونٹ کر مر جائے"!!

گلہائے رنگا رنگ

- سعید النجم
- سلیم الہٰی
- لطف الرحمٰن محمود
- سیّد نصیر احمد
- ظفر احمد
- ملک محمد رفیق آسد

سعید انجم
بی۔ اے فائنل

افسانہ

"اپنا خُدا"

بُرقع کے نقاب کی اوٹ سے اُس نے بازار کی گولائیوں کو خوب غور سے دیکھا۔ یہ وہی بازار تھا جس میں اس نے اپنا حسین بچپن گزارا تھا۔ "آہا !! مَیں اپنے دیس میں واپس پہنچ گئی" اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ خوش ہوگئی۔ وہ خوشی کے مارے اُچھلنا چاہتی تھی لیکن بُرقع کی وجہ سے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اُس نے کوئی اور موقع چھوڑ دیا لیکن وہ بازار کی ترقی دیکھ کر حیران بہت تھی ـــــ دو سال پہلے تو صرف چند ایک دُکانیں ہی دو منزلہ تھیں لیکن اب تو چند ایک ہی ایسی تھیں جو دو منزلہ نہ تھیں۔ بازار میں بھیڑ بھی کافی تھی، دکانیں چمک رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر اُسے دلی خوشی ہوئی کہ اس کا شہر بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

وہ ہولے ہولے خوشی کی موجوں کو تھپکتی ہوئی اُس موڑ پر جا پہنچی جہاں سے پیرس روڈ شروع ہوتی تھی۔ وہاں اُس کے کانوں میں ریڈیو کی غوں غاں کی آواز پڑی۔ اُس نے سامنے کی طرف اُس بڑی سی دکان کی طرف دیکھا جہاں سے یہ آواز آتی تھی اُسے وہاں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ وہ پہلے بھی شاندار تھی اور اب بھی شاندار تھی۔ اُس کے بھائی جان انگلینڈ جانے سے پیشتر وہاں ریڈیو ٹھیک کیا کرتے تھے اور وہ خود کھیلتی ہوئی اکثر بھائی جان کے پاس آکر یونہی ریڈیو کی سوئیاں گھما کر لاہور کی خبریں سُننے کی کوشش میں مصروف رہتی تھی۔ وہ ماضی کے اوراق جلدی جلدی پلٹتے ہوئے پیرس روڈ پر مُڑ گئی، اُسے کالج پہنچنے کی جلدی جو تھی۔ دو سال کے بعد آخر اُس نے اپنی پارٹی سے ملنا تھا۔ خوشی سے اُس کے قدم بھی ٹھیک طرح نہ پڑ رہے تھے۔ لیکن وہ اپنے شہر کو بھی اچھی طرح سے دیکھنا چاہتی تھی۔ پیرس روڈ پر سفیدے کے چھوٹے چھوٹے درخت اب کافی بڑے ہوگئے تھے اور وہ درخت جو سنٹرل سیکریٹیریٹ کے دفاتر کے گیٹ کے پاس تھا جہاں اکثر بچے جھولا جھولتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اب بہت اونچا نکل گیا تھا اور اُس کے ساتھ والے شہتوت کے درخت سے بچے شہتوت توڑ توڑ کر کھا رہے تھے ـــــ دو سال پہلے پیرس روڈ پر صرف بجری بچھی ہوئی تھی لیکن اب تو پکی سڑک تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کاریں چیرنگ کراس کی طرف پھسلتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ بعض چیرنگ کراس سے آگے سیدھی پیرس روڈ پر ہی گزر جاتیں اور بعض دائیں طرف ہمبگ روڈ یا بائیں طرف لزبن روڈ کو مُڑ جاتیں۔

اُس نے چیرنگ کراس پر پہنچ کے ہمبگ روڈ کی طرف دیکھا۔ سامنے لاریوں کا اڈہ دکھائی دے رہا تھا جس پر اب ایک بہت بڑے بورڈ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ بورڈ پر "بس سٹاپ" کے الفاظ اتنی دُور سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ پاس ہی مسجد نور

کے پُرشکوہ مینار دکھائی دیئے ـــــ لارنس روڈ پر اُسے بہت سے تانگے دکھائی دیئے۔ دھواں اُٹھتا ہوا بھی نظر آ رہا تھا۔ اُس وقت ایک انجن کی سیٹی بھی سُنائی دی۔ اسٹیشن پر شاید کوئی ٹرین کھڑی تھی۔ وہ جلدی سے آگے گزر گئی۔ چند ہی قدم پر اُسے اپنا پیارا کالج نظر آیا۔ کالج کا بورڈ شاید نیا لگایا گیا تھا۔ پیتل کے ڈھالے ہوئے الفاظ خوب چمک رہے تھے۔ وہ جلدی سے کالج میں گھس گئی اور بجری کی روش پر چلتے ہوئے اُس نے دائیں بائیں لگی ہوئی باڑ کو بڑے پیار سے دیکھا۔ اُس کی کٹائی بڑی خوبصورت کی ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے آفس کے آگے سے گزر کر کالج کمپاؤنڈ میں داخل ہو گئی۔

ـــــ بیوٹی سپیس (Beauty Space) میں اب اور بہت سے حسین پھول مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ اُس کا ایک دم سے اُن کو چوم لینے کو دل چاہا ـــــ وہاں موتیے کی کلیاں بھی دکھائی دیں جو اُسے بہت پسند تھیں۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہی اُس کی نظر بارہ دری پر پڑی۔ اُسے دیکھتے ہی اس کا ہاتھ خود بخود ماتھے کی طرف اُٹھ گیا۔ گویا وہ اُن یادگاروں کو سلام کر رہی ہو جو اُس سے وابستہ تھیں۔ کالج گراؤنڈ میں اُسے بہت سی لڑکیاں چلتی پھرتی دکھائی دیں لیکن اُن میں کوئی بھی اُس کی شناسا نہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی پُوری پارٹی یا پھر جتنی کا پیریڈ خالی ہوگا ضرور بارہ دری میں مل جائیں گی۔ اسلیئے وہ تیزی سے بارہ دری کی طرف بڑھی۔ بارہ دری میں صرف چند ایک لڑکیاں ہی موجود تھیں لیکن کوئی بھی اُس کی واقف نہ تھی۔ اُس نے اپنے مخصوص ستون کی طرف دیکھا جس کے ساتھ ٹیک لگا کر اُس نے سینکڑوں مسئلے حل کیئے تھے، کئی تقریریں یاد کی تھیں، وہاں اُسے ایک لڑکی نظر آئی جو اُس کے ساتھ پُشت لگائے پرے پھولوں کی طرف نظریں کیئے کھڑی تھی۔ ہَوا سے اُڑتے ہوئے کپڑے اُس کی موجودگی کا پتہ دیتے تھے۔ وہ ایک طرف ہو کے آگے بڑھی ـــــ وہ صوفیہ تھی۔

"صوفی ڈارلنگ" اُس نے آواز دی۔

صوفی نے مُڑ کر دیکھا "اری شانو!! ـــــ تم"! صوفیہ ایک دم ستون کی آڑ سے نکل کر شانو کے سینہ سے لپٹ گئی۔

"جانتی ہو کتنا یاد کیا تمہیں؟ ایڈریس بھی معلوم نہ تھا کہ کوئی خط ہی لکھ لیتی۔ تمہارے بغیر محفلیں نہ معلوم کیوں سُونی محسوس ہوتی تھیں۔ اور تم اتنی بے مروّت نکلیں کہ ایک خط بھی نہ لکھ سکیں"۔۔ صوفیہ نے باقاعدہ لیکچر شروع کر دیا تھا۔

شانو نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بھئی بس۔ شکوے شکایتیں بعد میں کرنا اور صفائی بھی میں بعد ہی میں پیش کروں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ ونی کہاں ہے؟ میکی کدھر ہے اور وہ اُس امنگی کا کیا حال ہے؟"

"امنگی بیچاری کی تو اُس موٹے اشفر کے ساتھ شادی ہو گئی" صوفیہ نے بتایا

"ہیں" شانو نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

صوفیہ اس کی طرف جُھک گئی۔ اُس نے اُس کے بازو پکڑ لئے۔

"تمہاری طبیعت خراب ہے شانو؟"

"نہیں، مَیں بالکل ٹھیک ہوں" شانو نے اپنے بازو چھڑاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اُسکے بازو اُس کے بھائی کے ہاتھ میں تھے۔

"تم خواب میں ڈر گئی تھیں شانو؟" اُس کے بھائی نے اُسے تھپکتے ہوئے کہا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "تو کیا مَیں خواب میں اپنے شہر واپس گئی تھی؟" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی "خواب ہی میں صوفی سے ملی تھی؟ اُف خدایا مَیں کیا کروں؟" وہ یہ کہتے ہوئے رو پڑی۔ پھر وہ اچانک چیخ پڑی۔ "بھائی جان! مجھے واپس لے چلو، اب مجھ سے مزید اِس موتے سینی ٹوریم میں نہ رہا جائے گا مَیں اپنے شہر واپس جانا چاہتی ہوں۔ مَیں اپنی سہیلیوں کو ملنا چاہتی ہوں۔ اگر کچھ عرصہ اَور مَیں یہیں رہی تو مَیں پاگل ہو جاؤں گی" —— اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

"خاموش رہو شانو تمہاری طبیعت خراب ہے" اس کے بھائی نے کہا "آؤ تمہیں ہاسپٹل تھیٹر میں لے چلوں۔ وہاں مریضوں کے لئے لگی ہوئی فلم دیکھو۔ طبیعت سنبھل جائے گی"۔

"مَیں نہیں جاؤں گی" اُس نے سر ہلا کر کہا۔ وہ سہیلیوں کے خیالات میں گم ہونا چاہتی تھی۔

"نہیں شانو" بھائی نے کہا "تمہاری طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اُٹھو شاباش" اُس کے بھائی نے اُس کے کندھے پر تھپکی دی۔

بھائی جس پیار اور خلوص سے کہہ رہا تھا وہ اس خلوص کا انکار نہ کر سکی۔ آخر اُس کے سہارے وہ اُٹھی اور وارڈ کے دروازے کی طرف چلنے لگی۔ وارڈ میں فقط دو چار مریض ہی لیٹے ہوئے تھے اور وہ بھی اس لئے کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے، باقی سبھی فلم دیکھنے کے لئے تھیٹر میں جمع تھے۔ تھیٹر کے باہر ہی اُن کے کانوں میں ڈم ڈم کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ شانو کو یُوں محسوس ہوا گویا وہ ٹرین میں سوار ہو کے اپنے شہر کو واپس جا رہی ہے اور کنارے پر واقع دریا کو عبور کرتے وقت پُل پر سے گزرنے کی آواز پیدا ہو رہی ہے۔ اُس نے اپنے بھائی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اندر داخل ہو گئی۔ کوئی پہاڑوں کا سین تھا سکرین پر۔

"میرا وطن، میرا شہر!" شانو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"پگلی" اُس کے بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

آگے بہت سی تصاویر اُس کو اپنے شہر ہی کی مانند لگیں اور اُس کا دل مزید شدت سے اپنے شہر واپس جانے کے لئے مچلنے لگا۔ اُس وقت ایک بڑی سی بلڈنگ پر وہ پر آئی جہاں چند لڑکیاں پھر رہی تھیں۔ اسے یُوں محسوس ہوا گویا وہ اُس کالج کے ہے وہ اپنے بھائی کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولی۔

"مجھے نہیں دیکھنی یہ فلم واپس چلئے بھائی جان!" آواز میں بڑی لجاجت تھی۔

"پاگل ہوئی ہو کیا، اتنی مزیدار تو ہے" اس کے بھائی نے کہا۔

"مجھے اپنا شہر یاد آرہا ہے" شانو نے اپنے بھائی کے کندھے سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"تم تو ہر وقت بس اپنا شہر اپنا شہر کرتی رہتی ہو۔ اب اگر تم ابھی وہاں جانے کے قابل نہیں تو فلم ہی میں "اپنا شہر" دیکھ لو تمہیں تو اِس فلم کو دیکھ کے خوش ہونا چاہیئے۔" اس کے بھائی نے کہا۔

اُس وقت پردہ پر ایک بارہ دری کی تصویر اُبھری جہاں کچھ لڑکیاں بیٹھی خوش گپیوں میں مشغول دکھائی دیں۔

"بھائی جان" شانو کے مُنہ سے آواز نکلی۔ آواز تقریباً بیٹھی ہوئی تھی۔

اُس کا رنگ زرد ہو گیا تھا، وہ اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اور وزن ایک طرف کر کے بھائی پر جھکتی جا رہی تھی۔ اُس کا بھائی اُس کی خراب طبیعت دیکھ کے گھبرا گیا۔ اُس نے جلدی سے اُسے سنبھالا اور وارڈ کی طرف چلنے لگا۔ وہ اُسے سہارا دیئے چل رہا تھا۔ راستے میں اُس نے شانو کو پکارا بھی لیکن شانو کے مُنہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ اُس کا جسم ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ بستر تک پہنچ کے وہ دھم سے بستر پر گر پڑی۔ اس کے بھائی نے اُس کی نبضیں ٹٹولیں تو وہ ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ شانو بیہوش ہو چکی تھی۔ اُس کا بھائی جلدی سے ڈاکٹر کو بلانے بھاگا۔

ڈاکٹر نے آکے دیکھا اور بولا "اِن کو کوئی صدمہ پہنچا ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی" شانو کے بھائی نے بتایا۔

"تو کیا یہاں لیٹی لیٹی ہی بیہوش ہو گئی ہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں" شانو کے بھائی نے بتایا "ابھی فلم تھیٹر میں یہ فلم دیکھ رہی تھیں، مناظر کچھ ہمارے شہر سے ملتے جلتے تھے یہ کہنے لگیں مجھے اپنا شہر یاد آتا ہے واپس لے چلو، میں نے ہنس کے ٹال دیا تو ان کی یہ حالت ہو گئی۔"

"ہاں تو یہ صدمہ ہی ہوا نا حضرت" ڈاکٹر نے کہا "یہ عرصہ سے اپنے شہر جانے کے لیئے مُصر ہیں، اِس وقت جذباتی ہو گئی ہوں گی۔ اب تو یہ کافی حد تک صحتمند ہیں۔ پھیپھڑے تو تقریباً ٹھیک ہو ہی چکے ہیں فقط کمزوری باقی ہے اب آپ صبح اِنہیں واپس لے جائیں تو بہتر ہے ورنہ ہو سکتا ہے اِن پر کوئی اور نفسیاتی اثر ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے جی" شانو کے بھائی نے جواب دیا۔

"ہاں اِس میں اب کوئی مضائقہ نہیں۔ بیماری تو دُور ہو گئی ہے۔ ہاں اگر وہاں پھر تکلیف ہو جائے تو فوراً یہاں لے آیئے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"بہت اچھا جی" شانو کے بھائی نے جواب دیا

★

شانو بہت خوش تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جب وہ ہوش میں آئی تو اُس کے بھائی نے اُس کو صبح واپس جانے کی خوشخبری سنائی تو اِس خوشی سے اُس کو بقیہ رات ٹھیک سے نیند بھی نہ آسکی۔ وہ اپنے شہر ہی کے متعلق سوچتی رہی اُس نے

سوچا کہ جب وہ دو سال کے بعد صوفی، بیگی اور روبی وغیرہ سے ملے گی تو اُن کو کتنی خوشی ہوگی۔ اِسی سوچ و بچار میں صبح کے تین بج گئے اور اُس نے لیٹے لیٹے ہی اپنے بھائی کو آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا۔

کوئی تین چار آوازوں کے بعد اُس کے بھائی کی آنکھ کھلی۔ اور تیاری کرنے کا حکم ملا۔

★

شانو اپنے شہر واپس پہنچ گئی۔ وہ اپنی امّی اور ابّا کو بڑی گرمجوشی سے ملی۔ گھر کی سب چیزوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ اپنی کمزوری کے باوجود ایک ایک کمرے میں گئی اور صحن میں بھی پھری اور آخر تھک کے لیٹ گئی۔ سارے دن کے سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے رات کو نیند خوب مزے کی آئی اور صبح اُٹھتے ہی اُس نے بھائی کو ٹیکسی لانے کو کہا۔

"ابھی آرام تو کرلو پھر کہیں چلی بھی جانا" اُس کی والدہ نے کہا۔

"میں تو ابھی کالج جاؤں گی" اس نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا کالج ہو آؤ" ماں نے اجازت دیدی۔

"بازار سے ہو کر جاؤں گی، آخر بازار بھی تو دیکھنا ہے" شانو نے مچلتے ہوئے کہا۔

بیٹے کا اشارہ سمجھ کر ماں کچھ نہ بولی اور بھائی ٹیکسی لینے چلا گیا۔

★

ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے اُس نے بُرقع کے نقاب کی اوٹ سے بازار کی گولائیوں کو خوب غور سے دیکھا۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی، دکانیں چمک رہی تھیں۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ اس کا شہر بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ بازار میں بھیڑ بھی کافی تھی۔ وہ ہوتے ہوئے خوشی کی موجوں کو جھیلتی بازار کو دیکھ رہی تھی ٹیکسی پیرس روڈ کو مڑی۔ پیرس روڈ پہ چھوٹے چھوٹے سفیدے کے درخت اب کافی بڑے ہو گئے تھے۔ بجری کی بنی ہوئی سڑک، اب پکی سڑک میں تبدیل ہو گئی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کاریں چیرنگ کراس کی طرف پھسلتی ہوئی نظر آتیں۔ بعض چیرنگ کراس سے گزر کر سیدھی پیرس روڈ پر چلی جاتی اور بعض ہمبگ روڈ یا لزبن روڈ پر مڑ جاتیں۔ شانو کی ٹیکسی چیرنگ کراس سے گزرتی ہوئی کالج کے سامنے جاکے رُک گئی۔ شانو بھائی سے تھوڑی دیر انتظار کرنے کا کہہ کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ بجری کی سڑک پر چلتے ہوئے اُس نے اِدھر اُدھر لگی ہوئی باڑ کو دیکھا وہ اُسے بہت پیاری لگی۔ آفس کے آگے سے گزر کر وہ کالج کمپاؤنڈ میں داخل ہو گئی ـــــ بیوٹی سپیس (Beauty Space) پر نظر پڑی۔ وہاں اب بہت خوبصورت قسم کے پھول زیادہ مقدار میں نظر آئے۔ آگے ہوتے ہی اُس کی نظر بارہ دری پر پڑی۔ اُس کا ہاتھ خود بخود ماتھے پہ اُٹھ گیا گویا وہ اُن یادوں کو سلام کر رہی ہو جو اُس سے وابستہ تھیں۔ کالج گراؤنڈ میں بہت سی لڑکیاں پھر رہی

ہوئی دکھائی دیں لیکن اُن میں اُس کی واقف کوئی نہ تھی۔ بارہ دری میں اُسے صوفی اور وینی نظر آئیں۔ وہ اُنہیں دیکھ کر بڑی گرمجوشی سے آگے بڑھی۔

"ہیلو!! صوفی اینڈ وینی"

انہوں نے بڑی سرد مہری سے ہاتھ ملایا۔

"تمہیں ٹی بی ہوگئی تھی نا" صوفی نے کہا۔ لہجہ سرد تھا، آواز میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہ تھی۔

شانو کے دل کو ٹھیس لگی لیکن پھر بھی برداشت کر کے بولی "ہاں ہوگئی تھی، اب تو ٹھیک ہوں۔"

"کہاں ٹھیک ہوئی ہو، ابھی تو تمہیں کافی علاج کی ضرورت ہے۔ آئینہ ذرا دیکھنا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کس طرح ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں" وینی نے کہا۔

——— اُس وقت شانو کو کھانسی اُٹھی۔

"دیکھا نا، ابھی تو تمہاری کھانسی بھی ٹھیک نہیں ہوئی۔" یہ کہتے ہوئے وینی نے رومال ناک پہ رکھ لیا۔

"اچھا۔ اب چلتی ہیں ہمارا پیریڈ ہے۔" صوفیہ وینی کا ہاتھ پکڑ کر چلدی اور شانو ویران آنکھوں سے گھورتی رہ گئی۔

وہ چند منٹ تو وہیں کھڑی رہی۔ پھر گیٹ کی طرف چل دی۔ اب کے واپس جاتے ہوئے نہ اُسے ہوئی پیس میں پھول ہی خوبصورت لگے نہ بجری کی سڑک پر چلتے ہوئے باڑ اچھی لگی۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

"ارے تم اتنی جلدی آبھی گئیں" اُس کے بھائی نے کہا۔

"ہوں۔ اب ذرا مسجد نور تک چلوں گی۔" شانو نے کہا۔

"کیوں؟" بھائی نے پوچھا۔

"میں نے مینار پہ چڑھنا ہے۔"

"پاگل ہوئی ہو کیا؟"

"ہوں"

"کیسی باتیں کرتی ہو تم شانو۔ ابھی تو تم تندرست بھی نہیں ہوئی۔"

"خیر ہے"۔ لہجہ عجیب سا تھا۔

ٹیکسی چیرنگ کراس سے ہوتی ہوئی ہمبگ روڈ پر مڑ گئی اور پھر مسجد کے گیٹ سے گزر کر آگے مینار کے پاس جا کے رُک گئی ——— شانو مینار کے دروازہ میں داخل ہوگئی۔ اُوپر سے میکی، اینکی اور روفی وغیرہ آرہی تھیں۔

شانو نے "ہیلو میکی، اینکی اینڈ روفی" کہہ کے ہاتھ بڑھایا۔

اُنہوں نے بڑی سرد مہری سے ہاتھ ملایا۔
"تمہیں ٹی بی ہوگئی تھی نا" مسکی نے کہا۔ لہجہ سرد تھا، آواز میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہ تھی۔
شانو کے دل کو ٹھیس لگی لیکن برداشت کرکے بولی "ہاں ہوگئی تھی، اب تو ٹھیک ہوں"
"کہاں ٹھیک ہو۔ ابھی تو تمہیں کافی علاج کی ضرورت ہے۔ آئینہ ذرا دیکھنا تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کس طرح ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں" اینکی نے کہا۔
اُس وقت شانو کو کھانسی اُٹھی۔
"دیکھا نا ابھی تو تمہاری کھانسی بھی بند نہیں ہوئی" روفی نے کہا۔
"اچھا اب چلتی ہیں، پیریڈ لینا ہے" مسکی یہ کہہ کے چل دی اور روفی اور اینکی اس کے پیچھے چل پڑیں۔
شانو ویران آنکھوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی ہی رہ گئی اور پھر چند منٹ تک بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر ایک دم دھم سے فرش پر گر گئی۔
گرنے کی آواز سُن کے اُس کا بھائی جلدی سے اندر داخل ہوا۔ شانو کا سر پھٹ گیا تھا اور بے ہوش پڑی تھی۔
ٹیکسی میں ڈال کر جلدی سے اُس کو پاس ہی مسجد سے ملحقہ ہسپتال میں لے جایا گیا۔

★

"پانی" چوبیس گھنٹے کے بعد ہوش میں آتے ہی شانو نے پکارا۔
اس کے والد نے پانی پلایا۔ والدہ سر دبا رہی تھیں۔
"اب تو ٹھیک ہوں امی چھوڑ دیجیے میرا سر" اُس نے کہا۔
"تمہیں منع بھی کیا تھا کہ ابھی کمزور ہو لیکن کیا مجال ہے جو تم مان جاؤ" اُس کا بھائی بول ہی پڑا۔
"ہوا کیا تھا آخر" والدہ نے پوچھا۔
"ہوا تو کچھ بھی نہیں، بس ایک چکر سا آگیا تھا" شانو نے کہا۔ بات گول ہی کر گئی۔
تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر نے آکے باتیں کرنے سے منع کر دیا۔
چند لمحوں بعد اذان شروع ہوگئی۔ شانو نے گھڑی پہ نگاہ ڈالی تو پورے بارہ بج رہے تھے۔ اُس نے سوالیہ نگاہوں سے بھائی کی طرف دیکھا۔
"آج جمعہ ہے" اُس کے بھائی نے بتایا۔
جمعہ کا خطبہ وہ بستر میں لیٹی ہی سنتی رہی۔ خطبہ کے آخر میں خطیب نے شانو کے حادثہ کا ذکر کرتے ہوئے اُس کی صحت کے لئے دُعا کی تحریک کی اور شانو کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

دو تین دن تک وہ ہر نماز کے بعد یا پہلے اپنی دُعا کے لئے اعلان سُنتی رہی۔ بہت سی عورتیں اس کی عیادت کے لئے آتی رہیں۔ اُس کی پارٹی کی کوئی لڑکی نہ آئی۔

تین چار دن میں اُس کی حالت کافی حد تک سنبھل گئی تھی لیکن ڈاکٹر کا خیال تھا کہ ٹی بی کا مرض دوبارہ عود کر آنے کا خطرہ ہے اسلیئے اُس کے بھائی جان اُسے واپس سینی ٹوریم میں لے گئے۔

★

آج شانو بہت خوش تھی۔ وہ ایک ماہ تک پھر سینی ٹوریم میں رہی تھی اور باقاعدہ اپنے شہر اور کالج کو یاد کرتی رہی لیکن اپنی پارٹی کو یاد نہ کر سکی۔ اس وقت وہ بہت خوش تھی کیونکہ کچھ وقت پہلے اُس کا بھائی بتا کے گیا تھا کہ وہ صبح واپس جا رہے ہیں۔

"سچ"۔ اُس نے خوشی سے چلّا کے پُوچھا۔

"ہاں"—— ہاں کو لمبا کرتے ہوئے اُس کے بھائی نے کہا "واقعی"۔

اُس کو خوشی سے بقیہ رات نیند نہ آ سکی۔ اپنے شہر ہی کے متعلق سوچتی رہی۔ اِس سوچ بچار میں صبح کے تین بج گئے تو اُس نے لیٹے لیٹے ہی اپنے بھائی کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔

کوئی تین چار آوازوں کے بعد اُس کے بھائی کی آنکھ کُھلی تو اُسے تیاری کا حکم ملا۔

★

شانو اپنے شہر واپس پہنچ گئی وہ اپنے امّی ابّا کو بڑی گرمجوشی سے ملی۔ گھر کی سب چیزوں کو غور سے دیکھا۔ اپنی کمزوری کے باوجود ہر ایک کمرے میں گئی اور صحن میں بھی پھری اور آخر تھک کے لیٹ گئی۔ سارے دن کے سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے رات کو نیند خوب مزے کی آئی اور صبح اُٹھتے ہی بھائی کو ٹیکسی لانے کے لئے کہا۔

"ابھی آرام تو کر لو پھر کہیں چلی بھی جانا" اُس کی والدہ نے کہا۔

"اب میں پہلے والی تو نہیں ہوں، بالکل تندرست ہو کے آئی ہوں" شانو نے ہنستے ہوئے کہا۔

★

ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے اُس نے بُرقع کی نقاب کی اوٹ سے بازار کی گولائیوں کو خوب غور سے دیکھا۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی، دکانیں چمک رہی تھیں۔ وہ بہت خوش ہوئی کہ اس کا شہر بڑی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ٹیکسی پیرس روڈ پر مُڑ گئی۔ کاریں سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھیں۔ بعض چیرنگ کراس سے گزر کر آگے پیرس روڈ ہی پر چلی جاتیں۔ بعض ہمبگ یا لزبن روڈ پر مُڑ جاتیں۔ شانو کی ٹیکسی چیرنگ کراس سے گزر کر آگے پیرس روڈ پر ہو گئی تو شانو پچھلی سیٹ سے جلدی سے بولی "دائیں طرف بھائی جان دائیں طرف ہمبرگ روڈ پر"۔

"کالج نہیں جاؤ گی کیا؟" اُس کے بھائی نے پوچھا۔
ٹیکسی ہمبگ روڈ پر مڑ گئی اور شانو کے کہنے پر مسجد کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔
"بس بس یہیں روک لو" دروازے کے قریب شانو چلائی۔
"کیوں؟ بیمار پر بھی نہ پڑھو گی کیا؟" بھائی نے دوبارہ پوچھا۔
"نہیں۔ میں سب سے پہلے اپنے خدا کو ملوں گی۔" اور یہ کہتے ہوئے شانو مسجد میں خواتین کے حصے میں جا کر شکرانے کے نفل ادا کرنے لگی۔

"عموماً میں اکبر حسین کی باتیں مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہوں لیکن ان کے فلسفۂ قناعت میں کچھ ایسی خوبی نظر آئی کہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اب میں جس قدر اس فلسفے پر عمل کرتا ہوں اس کی صداقت مجھ پر روشن ہوتی جاتی ہے۔ پہلے جب کبھی میں اپنا مُنہ آئینے میں دیکھتا تو اُسے زمین پر پٹک دیتا لیکن اب جو اس میں اپنی شکل دیکھتا ہوں تو خدا کا شکر بجا لاتا ہوں۔ چہرہ بُرا سہی لیکن اس لنگور سے بدرجہا بہتر ہے جسے میں نے چڑیا گھر کے پنجرے میں دیکھا تھا۔ خدا قادرِ مطلق ہے اگر چاہتا تو مجھے لنگور بنا دیتا۔ گو اب بھی اس میں بہت تھوڑی کسر اُٹھا رکھی ہے مگر الحمدللہ کہ بالکل لنگور نہیں بنایا۔ پہلے میں اپنا موازنہ لارڈ بائرن اور کلارک گیبل سے کیا کرتا تھا اور مجھے یاد ہے اتنی کوفت ہوتی تھی کہ اپنا چہرہ نوچ لینے کو جی چاہتا۔ مگر اب میں اپنا موازنہ حبشیوں اور شاعروں سے کرتا ہوں اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ بدصورت انسان بھی دنیا میں بستے ہیں۔ پہلے جب میری بیوی بدمزہ کھانا تیار کر کے میرے آگے رکھتی تو میں جل بھن کر کباب ہو جاتا۔ اب اسے زہر مار کرنے کی بجائے نہایت رغبت سے کھاتا ہوں۔ کھانا لاکھ بُرا سہی مگر اس کھانے سے اچھا ہے جو سنٹرل جیل میں "سی" کلاس کے قیدیوں کو دیا جاتا ہے۔ سالن میں نمک زیادہ ہی سہی لیکن اگر میری بیوی چاہتی تو سارا نمکدان سالن میں اُنڈیل سکتی تھی۔

اسی طرح جب میرے پاس پہننے کو کوٹ نہیں ہوتا تو میں اس بات ہی سے مسرت حاصل کرتا ہوں کہ میرے پاس قمیص تو ہے۔ اگر قمیص پھٹ جاتی تو یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ بنیان تو ہے۔ اگر بنیان بھی بے وفا ثابت ہو تو خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ جسم تو ہے۔ پچھلی سردیوں میں میرے پاس رضائی نہیں تھی لیکن میں ذرا پریشان نہ ہوا۔ میں نے سوچا ہزاروں گیدڑ ہر رات سردی میں ٹھٹھرتے ہیں اور شور مچا مچا کر لوگوں کی نیند خراب کرتے ہیں۔ میں ان گیدڑوں سے تو اچھا ہوں۔ میرے پاس رضائی نہیں لیکن میں لوگوں کی نیند تو حرام نہیں کرتا۔"

(شیشہ و تیشہ — کنہیا لال کپور)

سلیم الٰہی
بی۔ اے (سال دوم)

آخری فقرات

انسان جب اِس دُنیائے فانی سے کُوچ کرنے لگتا ہے تو اس کے دل سے اس دنیا کی محبت ختم نہیں ہوتی۔ جو خیال مرتے دم اس کے دل میں ہوتا ہے وہی بالعموم اس کی زبان سے نکلتا ہے۔ اگر مرنے والا کم حیثیت یا معمولی آدمی ہو تو یہ الفاظ ہوا میں زائل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ صاحبِ حیثیت ہو تو یہ الفاظ خود بخود ازبر ہو کر کتابوں میں آ جاتے ہیں اور ہمیشہ یادگار رہتے ہیں۔ ذیل میں اسی قسم کے چند فقرات دیئے جاتے ہیں:۔

- "اینگسے گوراس" ایک یونانی ماسٹر مرنے لگا تو اس نے بمشکل اتنا کہا:۔

"میرے طالب علموں کو ایک دن کی چھٹی دے دینا۔"

- ایک سکول ماسٹر مرتے وقت اپنے طالب علموں سے:۔

"لڑکو! شام ہو رہی ہے اب تم اپنے اپنے گھروں کو جا سکتے ہو۔"

- حکیم ارشمیدس یونانی پر جب فتویٔ موت صادر ہوا اور جلاد اُسے قتل کرنے لگا تو حکیم نے کہا:۔

"ٹھہرو، مجھے یہ مسئلہ حل کر لینے دو۔"

- سقراط پر الحاد کا الزام لگایا گیا تھا اور اُسے زہر دے کر مارنے کی تجویز ہوئی۔ جب وہ زہر کا پیالہ پینے لگا تو اُس نے یہ فقرے کہے:۔

"میری رخصت کا وقت آن پہنچا ہے۔ میں موت کے راستہ پر گامزن ہوتا ہوں۔ تم زندگی کی راہ لو۔ اِن دونوں راہوں میں کونسی بہتر ہے۔ یہ خدا ہی کو معلوم ہے۔"

- اصلاع متحدہ کا پریذیڈنٹ "آڈمز" مرتے وقت کہنے لگا:۔

"ہمیشہ کے لئے آزادی!"

- "الیگزینڈر اوّل" زارِ روس اپنی بیوی سے مرتے وقت کہہ رہا تھا:۔

"میں سخت تھکا ہوں۔"

- انگلستان کے بادشاہ اوّل کو پادریوں نے سازش کر کے قتل کرا دیا تھا۔ اس وقت آرک بشپ جکسن بادشاہ

کے سامنے کھڑا تھا۔ بادشاہ نے بے کسی کے عالم میں کہا:۔

"یاد رکھو!"

- انگلستان کی ملکہ الزبتھ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی:۔

"میری تمام مقبوضات صرف ایک لمحۂ زندگی کے عوض کوئی لے لے!"

- شاہِ انگلستان ولیم سوم گھوڑے سے گر پڑا۔ اس کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ڈاکٹر اس کی تیمارداری کر رہا تھا، مگر شاہ سخت تکلیف کی حالت میں کراہ رہا تھا۔ آخر جب مرنے لگا تو بے ساختہ اس کی زبان سے یہ فقرہ نکلا:۔

"کیا یہ درد اب یونہی رہے گا؟"

- "میکسی ملئن" شاہِ میکسیکو اپنی بیوی کارلاٹا سے کہنے لگا:۔

"کارلاٹا! کیا تم میرے درد کو کم نہیں کر سکتی ہو؟"

- "مورٹ" شاہِ نیپلز کے خلاف بغاوت ہو گئی اور باغی اُسے قتل کرنے لگے تو شاہ موصوف نے کہا:۔

"میرا چہرہ بچا لو، دل پر نشانہ لگاؤ۔"

- ایک انگلش کارڈینل "بومانٹ" کا آخری فقرہ یہ ہے:۔

"کیا موت سے مفر نہیں؟"

- سکاٹ لینڈ والوں کا بہادر سپہ سالار "جیمز کیمرون" جب میدانِ جنگ میں جان توڑ رہا تھا تو اُس کے منہ سے یہ فقرہ نکلا:۔

"میرے دوستو! میرے پیچھے چلے آؤ۔"

- "سلطان ٹیپو" شہید نے آخری دم ایک انگریز جرنیل سے کہا:۔

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔"

- "گولڈ سمتھ" شاعر مرتے وقت بہت بے چین تھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا کیا تمہیں بہت تکلیف ہے؟ شاعر بولا:۔

"آہ، بہت سخت تکلیف!"

- "مائیکل فیرے ڈے" موجد برق، مرتے وقت اپنی بیوی سے کہنے لگا:۔

"اب مجھے تمہاری شکل نظر آنے سے رہ گئی ہے۔"

- فرانس کا بادشاہ "چارلس ہشتم" مرتے وقت کہنے لگا:۔

"میں آئندہ کوئی گناہ نہیں کر سکوں گا۔"

- پرارتھنا سبھا کے سٹیج پر پہنچتے ہی جب مہاتما گاندھی کے سینے پر پستول کی تین گولیاں لگیں تو اُن کے ہاتھ سلام

کی صورت میں ہی اُٹھے تھے۔ اُس وقت اُن کے مُنہ سے دو لفظ نکلے تھے :۔

"ہے رام! ہے رام!!"

● ۔ سوامی دیانند نے مرنے سے کچھ دیر پہلے کہا تھا :۔

"سب میرے پیچھے کھڑے ہو جاؤ۔ چاروں طرف کے دروازے کھول دو۔"

● ۔ یوٹوپیا کے مصنف سر طامس مُر کو بغاوت کے جُرم میں سزائے موت دی گئی۔ گردن پر کلہاڑا پڑنے سے پہلے اُنہوں نے خوشی سے اپنی داڑھی سنواری اور گردن اُٹھا کر کہا :۔

"افسوس یہ کٹے گی، اس نے بغاوت نہیں کی تھی۔"

● ۔ فلاسفر ہیلے آخری وقت تک اپنی نبض کی رفتار دیکھتا رہا۔ موت کے وقت اپنے ساتھی کو اُس نے کہا :۔

"نبض چلنا بند ہو گئی۔"

● ۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے مرتے وقت دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ہوا میں لکیریں کھینچیں۔ اُن کے آخری الفاظ تھے :۔

"مَیں نہیں جانتا کیا ہو گا؟ کیا ہو گا؟"

● ۔ سروجنی نائیڈو نے اپنی سیکرٹری کو گیت سُنانے کو کہا۔ سیکرٹری بولی مجھے گانا نہیں آتا۔ بسترِ مرگ پر سے نائیڈو نے کہا "جیسا بھی آتا ہو گا، گاؤ۔" سیکرٹری نے گایا اور گلستانِ شاعری کی بلبل چہکے سے اُڑ گئی۔

● ۔ مشہور ناولسٹ شرت چندر چٹوپادھیائے ایک مصرعہ کہتے کہتے رحلت کر گئے :۔

"اما کے داؤ۔ اما کے داؤ۔"

● ۔ عظیم گویا "ویٹ ہوون" موت سے بیس سال پہلے بہرہ ہو گیا تھا۔ اُس کے آخری الفاظ کو سُن کر کون ایسا ہو گا جو اُس کی دلی خواہشات کی تکمیل کا خواہاں نہ ہو گا۔ اُس نے کہا تھا :۔

"مَیں بہشت میں سُن سکوں گا۔"

● ۔ مشہور گویتے یاپن نے آخری لمحات میں ایک گت جمانے کو کہا تھا :۔

"میری یاد میں موزارٹ بجانا۔"

● ۔ مشہور ناولسٹ "چارلیس ڈکن" جب موت سے پہلے لڑکھڑا کر زمین پر گرا تو اسے صوفے پر لیٹنے کے لئے کہا گیا۔ لیکن اُس کے مُنہ سے صرف اتنے ہی لفظ نکلے :۔

"زمین پر۔"

● ۔ انگریزی شاعر "کیٹس" فینی برنی کی یاد لئے بسترِ مرگ پر بولا :۔

"مَیں موت برداشت کر سکتا ہوں لیکن اس کی جُدائی نہیں سہہ سکتا۔"

● زندگی سے مایوس انگریز شاعر لارڈ بائیرن نے آخری لمحات میں کہا تھا "اب میں سوؤں گا"۔ اس کے بعد وہ دائمی نیند سو گیا۔

● ڈراما نویس "ریولیس" نے مرنے سے کچھ سیکنڈ پہلے کہا تھا :۔

"پردہ گرنے دو۔ کامیڈی ختم ہوئی"

● اپنی موت کے وقت فلاسفر "شلر" کے منہ سے نکلا :۔ "بہت سی باتیں صاف ہو رہی ہیں اور میری سمجھ میں آ رہی ہیں"۔ وہ کونسی باتیں تھیں ؟ یہ دنیا کو آج تک معلوم نہیں ہوا۔

● انگریز فلاسفر "ہابس" مرنے کے بعد روح کی کسی حالت کا بھی معتقد نہ تھا۔ مرتے وقت اس نے کہا :۔

"اب میں آخری سفر کرنے والا ہوں۔ اندھیرے میں ایک چھلانگ"

● گوپال کرشن گوکھلے نے انتقال سے پہلے خیال ظاہر کیا تھا :۔

"اب تک اس طرف کا تماشہ دیکھا اب دوسری طرف جا کر دیکھوں گا وہاں کیا لیلا چل رہی ہے"

● بھارت کے مشہور سیاست دان ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ :۔

"میں وہیں جانا چاہتا ہوں جہاں مہاتما گاندھی گئے کیونکہ وہاں دکھ درد نہیں ہے"

● کارڈنیل ولزلے نے آخری لمحات میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا :۔

"جس وفاداری سے میں نے اپنے شہنشاہ کی خدمت کی اس سے آدھی بھی اگر خدا کے لئے کرتا تو وہ بڑھاپے میں میرا ساتھ نہ چھوڑتا"

● والیٹر نے کہا تھا :۔ "مجھے آرام سے مرنے دو"

● امریکہ کے پریذیڈنٹ روزویلٹ نے مرتے وقت کہا تھا :۔ "میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے"۔ اس طرح اس نے اپنے دردِ سر کا ذکر کیا۔

● جارج واشنگٹن نے کہا تھا :۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے میں جانے والا ہوں۔ ڈاکٹر! مجھے آرام سے جانے دو"

● نیرو نے مرتے وقت افسوس ظاہر کیا کہ :۔

"میرے چلے جانے سے دنیا ایک بہت بڑا آرٹسٹ کھو بیٹھے گی"

● نپولین نے مرتے وقت ایک بہادر کی طرح اتنا ہی کہا تھا :۔

"فرانس۔ فوج۔ فوج کا سپہ سالار"

لطف الرحمٰن محمود

طنز و مزاح

"ٹیڈی ہے اب پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

(ماڈرن طالب علموں سے دلی معذرت کے ساتھ)

"ٹیڈی" کا لفظ تو سُنا ہوگا آپ نے ـــــ اور خیر سے ٹیڈی دیکھے بھی ہوں گے ـــــ مگر کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ اس لفظ سے کیا مراد ہے؟ ٹیڈی ہماری زبان میں حال ہی میں وارد ہوا ہے۔ اس کے لغوی معنی دریافت کرنے کے لئے ہمارے کالج نے انگریزی کے ایک پروفیسر صاحب کو اِس سال لندن بھیجا ہے۔ اُن کی واپسی پر لغوی معانی کا ہم سب کو علم ہو جائے گا لیکن اس کے اصطلاحی مفہوم کی تھوڑی بہت وضاحت تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔ اصطلاحی طور پر اس لفظ کے استعمال کا دائرہ خاصہ وسیع ہو چکا ہے۔ اِس دائرے کے نصف قطر کی ابھی تک پیمائش نہیں ہو سکی۔ سُنا ہے کہ اُردو اور ریاضی کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے ذی علم اصحاب سر اور پاؤں جوڑ کر کوئی فارمولا دریافت کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں لیکن میرا خیال ہے کوئی کُلیہ دریافت نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ یہ دائرہ دن بدن وسیع ہی ہوتا جا رہا ہے۔ غالباً اگلے سال کی "آل پاکستان اُردو کانفرنس" کے ایجنڈے میں یہ مسئلہ بھی رکھا جائے گا۔ پہلے بھی لوگ "طولِ شبِ فراق" ناپتے ناپتے لد گئے ہیں۔ دیکھئے کیا فرماتے ہیں علمائے بیچ اِس مسئلہ کے!!

بات دراصل یُوں ہے کہ بعض الفاظ ہی بڑے مبارک ہوتے ہیں، زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں۔ "واپڈا" ہی کو لے لیجئے اس کا بھی یہی حال ہے۔ اگر کبھی بجلی کی رَو رُک جائے تو کہا جاتا ہے کہ "بجلی کو واپڈا ہو گیا ہے" ـــــ کسی کارخانے میں ہڑتال ہو جائے تو شور مچ جاتا ہے کہ "فلاں مِل کو واپڈا ہو گیا ہے" ـــــ اگر ملازمت سے جواب مل جائے تو پھر "سروس کو واپڈا ہو جاتا ہے۔" اسی طرح اگر شادی خانہ آبادی کے کافی عرصہ بعد بھی خانہ بربادی رہے تو دل جلا شوہر کہہ دیتا ہے کہ "بیگم صاحبہ کو واپڈا ہو گیا ہے" یا وہ کہہ دیں گی کہ "میرے میاں کو واپڈا ہو گیا ہے۔!!"

بعینہٖ یہی حال لفظِ "ٹیڈی" کا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ "ٹیڈی" کو "واپڈا" سے بھی زیادہ معنوی وسعت اور مقبولیت نصیب ہوئی ہے۔ پاکستان کے نئے مرکز "اسلام آباد" میں بڑی عظیم الشان عمارات بن رہی ہیں۔ کچھ چھوٹے چھوٹے کوارٹرز بھی بنے ہیں۔ انہیں یار لوگوں نے "ٹیڈی کوارٹرز" کا نام دیا ہے۔ اعشاری نظام کے نئے پیسوں کو "ٹیڈی پیسے" کہا جانے لگا۔ اور ہماری بے بے چاری "فرنچ کٹ داڑھی" (جو خیر سے اب پھر راہِ راست پر آ رہی ہے)

"ٹیڈی داڑھی" کہلانے لگی ہے۔ اسی طرح بعض ماڈرن قسم کے نوجوانوں خصوصاً طلبہ کو "ٹیڈی" کے معزز خطاب سے نوازا گیا ہے۔ اگر اِس مضمون کی ہمارے بزرگوں کو خبر نہ کی جاتے تو ہم آج اِس موضوع پر "اندھیرا" ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں!!

ہمارا پس منظر اور ظہور

کئی اصحاب کو افسوس ہوگا کہ ہمارے حلقے میں یعنی ماڈرن طلبہ کے گروہ میں دن دُونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل پاکستان میں ہمارا وجود اِس طرح تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی قیمت صفر تھی لیکن چند سال کی بات ہے کہ بیرونی دُنیا سے چند نمونے یہاں آئے اور ملک وملت کی خوش قسمتی ہے کہ ہم نے ان نمونوں کے رنگ میں رنگین ہونے کا فیصلہ کیا۔ "پاکستان ٹیڈی بوائے" دراصل امریکن "کاؤبوائے" کا پاکستان ایڈیشن ہے۔ وہاں ایسے "کندذہن" نوجوانوں کو جو سکول کالج وغیرہ میں پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے، کھیتوں میں ٹریکٹر چلانے اور دوسرے زرعی اور صنعتی کام سرانجام دینے کے لئے بھیج دیا جاتا۔ ہمارے ملک میں ذرا فرق پڑجاتا ہے۔ امریکہ میں ایسے نوجوان سکولوں اور کالجوں سے نکالے جاتے ہیں۔ یہاں ایسے نوجوان عموماً سکولوں اور خاص طور پر کالجوں کا رُخ کرتے ہیں!!

امریکہ سے گندم، سیکنڈ ہینڈ کپڑے اور خشک دُودھ کے ڈبوں کے ساتھ ساتھ "کاؤبوائز" کے نمونے بھی ملک میں آئے —— گندم ہم نے کھالی یا بلیک کرکے بنیادی جمہوریت کے ووٹروں کے لئے پیسے جمع کر لئے —— طلبہ اور مریضوں کے لئے مفت ملنے والے خشک دُودھ کے ڈبے ہم نے ڈبل ریٹ پر فروخت کر دیئے —— جو سیکنڈ ہینڈ کپڑے تھے اُنہیں "تھرڈ ہینڈ" کرنے کے لئے "منڈی" سے خرید کر زیب تن کر لیا اور دُوپہرے چالیس سیر اُوت بن کر سڑکوں پر نکل آئے —— اور لوگوں نے ہمیں ٹیڈی کہنا شروع کر دیا۔ یہ ہے ہمارے ظہور کی مختصر داستان!! اِس طرح ہم نے خاموشی سے "سٹارٹ" لیا۔ اور اللہ کی دین ہے کہ جراثیموں کی طرح ہماری نشوونما تیزی سے ہو رہی ہے —— مقامِ مسرت ہے کہ اِس لحاظ سے ہمارا مستقبل روشن، تابناک اور درخشندہ ہے!

ہماری بعض خصوصیات

کسی پبلک جگہ پر —— کسی بس سٹینڈ پر —— کسی ہوٹل میں —— کسی ریلوے سٹیشن پر —— اور سب سے زیادہ کسی کالج میں —— آپ کو ہماری زیارت کا شرف حاصل ہوسکتا ہے۔ فارسی کے ایک مقولے کا مطلب ہے کہ وہ مُشک ہی کیا جس کی خوشبو کی خبر عطار دے —— اِسی طرح وہ ٹیڈی ہی کیا جس کا حدود اربعہ دوسرے کو بیان کرنا پڑے!! کوئلوں کے انبار میں ایک ہیرا ہو فوراً پہچانا جاتا ہے اسی طرح ہزاروں کے ہجوم میں اگر ایک بھی ٹیڈی ہو تو خود بخود نظر آجاتا ہے۔ لیکن چونکہ چیز نئی ہے اور کمپنی کو اِن "مصنوعات" کی وسیع پیمانے پر پبلسٹی کی ضرورت ہے اس لئے مَیں خود ہی اِس طبقے کی "جنرل پیراپرٹیز" یعنی عمومی خصوصیات کا ذکر کرنے کی جُرأت کرتا ہوں مگر اِس شرط کے ساتھ کہ ع

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ!!

(ا) <u>تنگ اور چُست لباس</u>: سب سے نمایاں خصوصیت مخصوص تنگ اور چُست لباس ہے۔ بعض لوگ تو اس کی سائیکالوجی بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس طرح خواہ مخواہ ہتک کرتے ہیں۔ ایسی سائیکالوجی جائے بھاڑ میں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہم "SMART" لگنے کے لئے ایسا مختصر لباس استعمال کرتے ہیں۔ لباس کیا ہے ایک جُراب یا غلاف ہے جسے سارے جسم پر ہم نظرِ بد سے بچنے کے لئے چڑھا لیتے ہیں۔ خاص طور پر پینٹ تنگ ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا پینٹ نے ہمیں پہن لیا ہے۔ لباس جسم کے ساتھ بالکل چپکا ہوتا ہے۔ غالبؔ نے بھی ایسے ہی منظر سے متاثر ہو کر لکھا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ٭ ٹیڈی ہے اب پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس طرح ساری چُستی اور کاہلی جاتی رہتی ہے۔ ایک کمزوری ہے کہ انگڑائی لینے سے "تو پینٹ" کھُل جانے کا امکان ہوتا ہے۔ عملاً اول تو ہم انگڑائی لیتے ہی نہیں کیونکہ اس ادا کی دیکھنے والے تاب ہی کب لا سکتے ہیں۔ ویسے اگر ہم انگڑائی لینے کی کوشش کریں تب بھی نہیں لے سکتے۔ اس سے اندازہ کریجیے کہ ہم کتنے چُست اور سمارٹ ہوتے ہیں! لباس کے ساتھ انتہائی نوکدار بُوٹ ہوتے ہیں جن کی نوک ائیر فورس کے تازہ ترین جیٹ سے ملتی جُلتی ہے، اس سے ہمارے مجاہدانہ ذوق پر روشنی یا اندھیرا پڑتا ہے!! اس کے علاوہ سر کے بال ہماری بڑی قیمتی متاع ہیں۔ ایک ایک بال کی حفاظت اور سلامتی اور نشو و نما کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ آخر کیوں نہ ہو ہماری اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کا ہمارے بالوں سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جہاں تک "میک اپ" کا تعلق ہے بس ہم ہیں اور کریم پاؤڈر ہے!! تڑخ تڑخ ہمارے چہرے سے نور برستا ہے۔ لوگ کہتے ہیں "آنکھ ایک نہیں کھلوٹیاں تو تو!" کہتے رہیں ہم دل سے سمجھتے ہیں کہ ؏

ہمچو ما دیگرے نیست!!

(ب) <u>"زندگی" سے دلچسپی</u>: یہ ایک ادبی اصطلاح ہے، ڈرتے ڈرتے یہاں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری دوسری خصوصیت یہی "زندگی سے دلچسپی" ہے۔ ہم لوگ زندہ ہوتے ہیں اور زندگی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ زندگی کی تلاش میں ہم رات گئے تک سڑکوں اور گلیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ایسی دھوپ جس میں ہرن کا رنگ کالا ہو جاتا ہے ہمارے لئے بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ جہاں تک گانے اور گنگنانے کا تعلق ہے بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہماری آواز میں گٹاریاں بھری ہیں۔ ایسی آواز سے گاتے ہیں کہ کسی قبر کے کنارے جا کر اگر اس آواز سے فاتحہ پڑھیں تو قبر شق ہو جائے اور سالم تابوت وجد کر اُٹھے۔!! گھنٹوں بس سٹینڈ پر مناظرِ قدرت کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ زندگی کو کہ بدنے کے لئے ہم کچھ چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتے ہیں۔ زندگی چونکہ آرٹ ہے اسلئے ہم اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگرچہ اس تجرباتی مطالعے میں ہمیں کبھی کبھی سر بازار بے بھاؤ کی

پڑ جاتی ہیں ـــــ مگر یہ تو "طلبِ صادق" کا ثبوت ہے کبھی کبھی ہوائی چپل یا سینڈل کھا لینے کے بعد بھی ہم بڑے ادب سے پوچھ لیتے ہیں ع

"سایہ ہوں تو ساتھ نہ رکھنے کا سبب کیا ؟"

لیکن زندگی کے مفصل مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ع

عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

زندگی کی تلاش میں سرگرداں رہنے کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے - اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ گورنمنٹ نے خواہ مخواہ .D . W . P کا محکمہ بنایا ہوا ہے - سڑکوں کے معاملات میں ہماری خدمات مفت حاصل کی جا سکتی ہیں - ہم لوگ چلتے پاؤں کی بلی کی طرح کوچہ گردی پر مجبور ہیں - سادی "روڈ پولیشن" ہم بے کم و کاست بیان کرنے پر قادر ہیں - کبھی کبھی زندگی کی تلاش میں ہمیں تانگوں کے پیچھے کافی فاصلے تک بے جان کی بازی لگاتے ہوئے بھی ــــ سائیکلیں دوڑانا پڑتی ہیں۔ دیکھیو "رستم" اور "سہراب" سائیکل اس غرض کے لئے کافی مفید پائے گئے ہیں لیکن اگر کبھی تانگا خدانخواستہ پولیس سٹیشن کی طرف رُخ کرے تو ہم یہ کہہ کر کالج کا رُخ کر لیتے ہیں ع

وائے پڑیں صنم ترے ایسے پیار پہ

(ج) **"پان - بیڑی - سگریٹ"** :- یہ چیزیں ہماری غذا ہیں (بعض دل جلوں کا خیال ہے کہ اگر ہماری تعلیم سے دلچسپی کا یہی حال رہا تو انہی چیزوں کی تجارت پر ہماری معاش کا انحصار ہوگا) - پان سے ہمارے زرد ہونٹوں پر لالی آ جاتی ہے اور پرانے شعراء کے کلام میں جو "لعلیں" اور "شیریں" لبوں کا ذکر ملتا ہے - اس کی یاد اس گئے گزرے زمانے میں بھی تازہ ہو جاتی ہے - بیڑی سے ہمارے اندر خاص قسم کی "لکھنویت" پیدا ہو جاتی ہے اور ہم ذرا نستعلیق قسم کے آدمی بن جاتے ہیں - پان کی پیک سے عموماً ہم کالج کے برآمدوں اور خصوصاً ان دیواروں پر جن پر تازہ قلعی کرائی گئی ہو ـــــ "معاہدہ استنبول" میں شامل ممالک کے نقشے بناتے ہیں تا دوسرے طلبہ خصوصاً شہریت اور سیاسیات کے طلبہ بھی اسے سمجھ سکیں - ان نقشوں میں کچھ ایسا حسن ہوتا ہے کہ تجریدی آرٹ کے اعلیٰ نمونوں کا گمان ہوتا ہے - اور تو اور شعبۂ شماریات کے متعلقین ان خاکوں کو تحائف گردانتے ہوئے ان کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں !!

جہاں تک سگریٹ کا تعلق ہے اس کے بغیر ہمارے خیالات مجتمع نہیں ہو سکتے - اور بھی اس کی کئی جگہ ضرورت پڑتی ہے ! مقامِ مسرت ہے کہ ہمارے ملک میں سگریٹ کی صنعت بڑی ترقی کر رہی ہے - ساتھ ساتھ ڈاکٹروں کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے - دوسری منشی اشیاء بھی ہماری صحت اور سلامتی کیلئے حد درجہ مفید پائی گئی ہیں !!

(د) **وسیع مطالعہ کی عادت** :- مضمون کے ابتدائی حصے میں "مطالعۂ قدرت" کا ذکر ہو چکا ہے - اس کے

علاوہ ہم لوگ "متعلقہ لٹریچر" کا مطالعہ بھی گہری نظر سے کرتے رہتے ہیں۔ وہی وہانوی اور ابنِ صفی کے "پاکیزہ ناول" اکثر ہمارے زیرِ مطالعہ رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے رسائل اور "حفظانِ صحت" سے متعلق خاص جرائد مثلاً "خضرِ راہ" وغیرہ ہمارے شیلف کی زینت بنے رہتے ہیں اور اُن سے ہمارے دلوں میں حرارت اور اذہان میں جِلا پیدا ہوتی ہے۔ انگریزی اخبارات میں سے ہمیں "پاکستان ٹائمز" زیادہ پسند ہے کیونکہ اس کے تیسرے صفحے پر ہماری دلچسپی کے لئے ٹھوس معلومات اور اعداد و شمار دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اخبارات میں سے "ضرورت ہے" ۔۔ "WANTED" ۔۔ "SITUATION VACANT" وغیرہ عناوین کے تحت دیئے گئے مندرجات کو حفظ کر لیتے ہیں لیکن افسوس ہے ہمیں کوئی بھی "جاب" (JOB) پسند نہیں آتا۔ اور اگر ہم کوئی کام پسند کر لیتے ہیں تو متعلقہ اربابِ اختیار اپنی جہالت اور ناقدری کا ثبوت دے کر ہمیں ناپسند کرتے ہیں۔ اچھا آخرکار خود ہی پچھتائیں گے !!

(س) <u>ہوٹلوں، ریستورانوں اور قہوہ خانوں کی سرپرستی</u> :۔ ان ثقافتی "اداروں" کی سرپرستی کو ہم اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں۔ اس جگہ بیٹھ کر ہم زندگی، آرٹ، فائن (FINE) کمپارٹمنٹ، اور اپنے مستقبل میں حائل ہونے والی دیگر مشکلات پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم نے کئی ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے پیسے مار لئے ہیں اور ہماری برکت سے وہ دیوالیہ بھی ہو گئے ہیں لیکن نئے لوگ ہمارا اعتبار کر جاتے ہیں اس لئے ہم اس بات کے حق میں ہیں کہ ہر سال نئے ہوٹل اور ریستوران کھلتے جائیں اور پرانے بددیانتوں کو شہر بدر کر دینا چاہیئے۔

الیکشن کے موسم میں اگرچہ ہوٹلوں میں ہماری آمد و رفت بڑھ جاتی ہے لیکن "جدید کالج اکنامکس" کی "الیکشن تھیوری" کے پیشِ نظر ہمارا خرچ کم ہو جاتا ہے۔ الیکشن میں حصہ لینے والے اصحاب ہماری خدمت کر کے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اور ہم "حسبِ توفیق" "سب پارٹیوں سے" "مخلصانہ" تعلقات اور مراسم قائم رکھتے ہیں۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھ کر اور اُن کے باہر کھڑے ہو کر رات گئے تک ہم دنیا کے تمام اہم مسائل پر گفتگو کرتے ہیں ـــــ "وائٹ ہاؤس" سے "مائی دی جھُگی" تک ـــــ تمام اہم معاملات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک اپنی پڑھائی کا تعلق ہے افسوس ہے کہ وقت کی کمی آڑے آتی ہے !!

ان خصوصیات کے علاوہ ہمارے چند محبوب مشاغل اور بھی ہیں جو حد درجہ معصوم ہیں اور ان کے پیچھے نیک جذبہ کارفرما ہے۔ مثلاً پبلک پارکوں سے سائیکلیں اور کاریں کھسکا کر نامعلوم مقام پر چھوڑ آنا۔ تاکہ ان لوگوں کو کچھ پیدل چلنے کا موقع ملے اور ان کی صحت اچھی رہے۔ سٹریٹ لائٹ کے بلب چکنا چور کرنا ـــــ تاکہ عوام کو بلیک آؤٹ کی مشق ہو۔ علیٰ ہذا القیاس، باتیں تو اور بھی ہیں، اچھا کبھی پھر سہی !!

ہمارے سالنامہ پر تبصرہ

مؤقر جریدہ ہفت روزہ "لاہور" لاہور نے المنار کے گزشتہ شمارہ (سالنامہ) پر مندرجہ ذیل تبصرہ شائع فرمایا ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ ریکارڈ کرتے ہیں۔ (ادارہ)

"المنار"

مدیر اعلیٰ: ——— عطاء المجیب راشد

"المنار" کے چودھویں سال کا (جولائی، اگست، ستمبر کے لئے) زیر تبصرہ اشتراکی شمارہ ۲۰×۳۰ سائز کے ۸۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جن میں سے ۴۸ صفحے انگریزی اور دس عربی لٹریچر کے لئے وقف ہیں۔ انگریزی حصہ تفسیر القرآن سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد "حقیقی قربانی" کے موضوع پر تبرکات ہیں۔ اور پھر "مذہب اور معاشرہ" (RELIGION AND SOCIETY) کے عنوان سے "مقبول ملک" کا ایک مقالہ۔ پھر شہد کی مکھی کے کام، اشتغال، انہماک اور ان کے نتائج کے متعلق ایک معلوماتی مضمون جسے قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے بعد "روس میں تعلیم" کے عنوان سے ایک تعارفی تجزیہ ——— اسی طرح ایک اور تجزیہ حیوانات سے متعلق ہے اور دوسرا نیوکلیئر ری ایکٹروں کے بارے میں کہ یہ کب بننے شروع ہوئے؟ کس طرح معرض وجود میں آئے؟ ان کے حقیقی فوائد کیا ہیں؟ اور یہ انسانیت کے کیسے کیسے دکھوں کا مداوا بن سکتے ہیں؟ اور آج کے ترقی پذیر ممالک کو ان کی کتنی ضرورت ہے؟ ——— آخری مقالہ کینیا کے نعرۂ آزادی "اوہورو" (OHVRU) پر ہے۔ نعیم عثمان چوہدری کے قلم سے جس میں کینیا کے مجمل سیاسی و جغرافیائی کوائف کے ساتھ ساتھ اہل کینیا کے جہادِ حریت کا تعارف بھی آ گیا ہے۔ یہ حصہ کالج کی پنجاب یونیورسٹی کی چمپئن کشتی ران ٹیم کے اپنے پرنسپل کے ساتھ ایک فوٹو پر ختم ہوتا ہے۔ اداریہ تعلیمی ادارہ کے عمر کی اکیسویں بہار میں پہنچ جانے سے متعلق ہے۔ بہتر ہوتا اگر اس پر ایڈیٹوریل کی بجائے (GRATITUDE) یعنی "تشکر" کا عنوان جمایا جاتا۔

درمیانی دس صفحے عربی ادب سے متعلق ہیں ——— سب سے پہلے عربی ادب کی فضیلت کا بیان۔ پھر نعت فی مدح النبی الامی۔ پھر شاعرِ رسالت پناہ حضرت حسان بن ثابت کے رنگ سخن پر ایک مختصر مقالہ۔ آخر میں مدیر مجلہ کے قلم سے علم کے فضائل اور اس کے حصول کی مبارک جدوجہد سے متعلق مضمون الٰہی ارشادات کی روشنی میں۔

سب سے زیادہ صفحات اُردو ادب کے لئے وقف کئے گئے ہیں جو وطنِ عزیز کی قومی زبان کا حق بھی ہے۔ یہ حصہ صحیح معنوں میں طلباء کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے اور اس میں جلسہ تقسیم اسناد پر پڑھی جانے والی مبسوط سالانہ رپورٹ اور خطبہ صدارت بھی شامل ہیں۔ جن سے اس اعلیٰ تعلیمی و تربیتی ادارہ کی روز افزوں ترقی سے آگہی ہوتی ہے۔

"شبستانِ غزل" کے علاوہ باقی تمام باب (مقالات و مضامین، گلہائے رنگا رنگ اور دامِ خیال) زیادہ تر طلباء ہی کے رشحاتِ فکر سے مزین و مرتب ہیں۔ مختصر و فصیح ادب پارے، چھوٹی چھوٹی واقعاتی کہانیاں ادبی رنگینیوں سے معمور۔ مزاح میں شستگی۔ فقرے بازی میں حفظِ مراتب ——— اشعار میں جولانیٔ شباب کے پہلو بہ پہلو پاکیزگی اور افسانے فکری بے راہ روی کی مسموم و خاموش اکساہٹوں سے مبرا ——— خاص طور پر پہلے حصہ کا مقالہ "ساٹھ قصیدے" تو اپنے قاری کی معلومات میں بیش قیمت علمی اضافہ کرتا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی ترتیب و تدوین حوصلہ افزا بھی ہے خوش آئند بھی۔ اللہ ان وسیع نوخیز مساعی میں برکت ڈالے۔

کتابت ٹائپ اور طباعت عمدہ۔ کاغذ کرافٹی خوشنما چکنا۔ سرورق دبیز ——— قیمت و سالانہ چندہ درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ"

——— (ہفت روزہ "لاہور" ۱۴ دسمبر ۱۹۶۴ء) ———

آ دیکھ ہے کیا بات مرے دیدۂ تر میں
ہنگامہ سا ہے جس سے ترے قلب و نظر میں
تم کون ہوئیں کون ہوئی یہ مجھ سے نہ پوچھو
اس بات کا ہے ہوش کسے تیرے نگر میں
جیسے کوئی منزل کا پتہ بھول گیا ہو
ہوں ایسا پریشان تمنا کے نگر میں

——— (بشارت احمد بسمل)

راہی

پگڈنڈیاں

گزشتہ شمارہ سے ہم نے اس نئے کالم کو شروع کیا تھا اور طلباء کو شرکت کی دعوتِ عام دی تھی لیکن خلافِ توقع بہت کم طلباء نے اس طرف توجہ کی ہے۔ اس کالم کی رونق طلباء کے تعاون پر منحصر ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ گزرگاہوں کی رونق ان پہ چلنے والوں سے وابستہ ہوتی ہے اور اگر "راہی" پگڈنڈیوں کی طرف بڑھنا ترک کر دیں تو پگڈنڈیوں کے نشانات بھی آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو کر ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ (مدیر اعلیٰ)

انقطاعِ انسانیت

گزشتہ سال دسمبر کی ایک سرد رات ـــ میں اپنے ایک دوست کو سائیکل واپس کرنے کے لئے احمد نگر جا رہا تھا میں نے رات وہیں بسر کرنی تھی۔ جب میں گھر سے چلا تو اس وقت معمولی سے بادل آسمان پر چھائے تھے جب میں نصف رستہ طے کر چکا تو خوب زور کی بارش شروع ہو گئی۔ بادل بھی گرج رہے تھے اور بجلی بھی بہت تیز کوند رہی تھی۔ سڑک کے ارد گرد کوئی جگہ نہیں تھی جہاں میں پناہ لے سکتا ـــ میں نے اپنے جسم کو گرم کپڑوں سے خوب چھپا رکھا تھا مگر بارش کی وجہ سے کپڑوں کی نمی نے مجھے گویا "ریفریجریٹر" بنا دیا ـــ میں کانپتے ہوئے ٹھٹھرتی ٹانگوں سے سائیکل تیز سے تیز تر چلانے کی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ مجھے سڑک پر ایک کار کھڑی دکھائی دی میں نے سوچا چلو اس کار میں بیٹھ کر ذرا پناہ لے لوں۔ میں کار کے پاس پہنچا تو مجھے ایک بوڑھا دیہاتی بھی کھڑا نظر آیا جو باہر کھڑا کار والے سے کار کے اندر جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ وہ بے چارہ سردی سے بُری طرح کانپ رہا تھا مگر سنگدل کار والا اُسے دھتکار رہا تھا۔ میں نے اس بوڑھے دیہاتی کو سائیکل پر بٹھایا اور اپنا ہینچ کوٹ اتار کر اُسے پہنایا تا کہ وہ بھی سردی سے کچھ تو محفوظ رہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم احمد نگر پہنچ گئے۔ مگر تمام راستہ میں یہ سوچتا رہا کہ مانا امارت و غربت نے ہمیں معاشرہ میں دو درجے دے دیئے ہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ امیر غریبوں سے رشتۂ انسانیت ہی منقطع کر لیں۔ (ملک محمد رفیق آسعدی۔ اے)

قہرِ الٰہی

چند دن ہوئے میں اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے اسکے گاؤں گیا تو وہاں اُس نے مجھے اپنے گاؤں کا ایک تازہ سبق آموز واقعہ سنایا۔

کہنے لگا کہ چند ماہ پیشتر گاؤں کے نمبردار کو اس کے سگے بیٹے نے قتل کروا دیا۔ پہلے کچھ دن تو قاتل نہ پکڑا گیا مگر پھر یہ راز افشا ہو گیا۔ نمبردار کا بیٹا اور قاتل دونوں پولیس کے ہاتھ آ گئے لیکن نمبردار کے بیٹے اور قاتل نے عینی گواہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے مقدمہ اپنے حق میں کروا لیا۔ ابھی ان دونوں یعنی قاتل اور نمبردار کے بیٹے کو گاؤں میں جیل سے آئے ہوئے چند دن ہی ہوتے تھے کہ ایک رات ان دونوں کو کسی نے سوتے میں قتل کر دیا۔ پولیس نے بھی تفتیش کی، دوسرے لوگوں نے بھی مگر کسی قسم کا سراغ نہیں ملا۔ یہاں تک کہ قاتل کے پاؤں کے نشانات بھی لاشوں کے پاس نہیں پائے گئے ــــ میں ڈر سا گیا اور بے اختیار کہہ اٹھا کہ یہ قہرِ الٰہی ہے جو ہر ظالم سے اس کے ظلم کا بدلہ لیتا ہے ــــ (ظفر احمد)

ممنونیّت

میرے ایک دوست نے گزشتہ دنوں ایک عجیب واقعہ سنایا کہ سردیوں کی ایک رات کا ذکر ہے میں اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ایک جگہ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اسی اثناء میں ایک سوالی آیا۔ پھٹے پرانے کپڑے، پاؤں میں ٹوٹی ہوئی جوتی، بے چارہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ نہ معلوم وہ کہاں سے اور کب چلا تھا۔ روٹی کی طلب نے اسے در بدر کے چکر لگانے پر مجبور کر رکھا تھا اور اب وہ یہاں صدا بلند کر رہا تھا۔ ہمارے کھانے کا پروگرام ختم ہو چکا تھا اور ابھی کچھ زائد کھانا باقی تھا میں نے اس سوالی سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس سالن ڈالنے کے لئے کوئی برتن ہے؟ وہ کچھ نہ سمجھ سکا جب ہاتھ کے اشارہ سے سمجھایا گیا تو اس نے ہاتھ ہی کے اشارہ سے نفی میں جواب دیا۔ اور یہ دیکھ کر دل کو اور ٹھیس پہنچی کہ بے چارہ بہرہ بھی ہے اور قوتِ گویائی سے محروم بھی، اس بے چارے کی زندگی کیسے بسر ہوتی ہوگی؟ یہ تصوّر کر کے میں لرز گیا، فوراً ایک برتن مہیا کر کے میں نے اسے چند روٹیاں اور سالن دے دیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی اور خوشی کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے وہیں بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا۔ میں اس کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی نوالے اٹھا رہا تھا ــــ نہ معلوم کتنی دیر سے وہ ان چند نوالوں کو ترس رہا تھا ــــ بہرحال کھانا کھا چکنے کے بعد وہ اٹھا۔ برتن میرے حوالے کیے اور بڑے تشکّر آمیز انداز میں سلام کیا۔ اس کی آنکھیں اس کی قلبی کیفیت کی کسی قدر عکّاسی کر رہی تھیں لیکن زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔ پھر وہ انہی جذبات سے اس قدر مغلوب ہوا کہ بے اختیار آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میرے دوست ممنونیت کے اس منظر کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے ــــ دنیا میں احسان کو احسان سمجھنے والے اور اس کا بدلہ دینے کی آرزو رکھنے والے تو بہت ہیں کوئی احسان میں ابتداء کرنے والا تو ہو۔!

(سید نصیر احمد۔ سالِ دوم)

شاخِ گُل

- فیض عالم فیض
- ارشد ترمذی
- لطف الرحمٰن محمود
- مبارک احمد عابد

فیض عالم فیض چنگوی

اجازت ہو تو رازِ دل کو مَیں خود ہی عیاں کر دوں
کروں خونِ تمنّا خود، تمنّا کو بیاں کر دوں

زمانہ طعنہ زن ہے کہ مجھے تجھ سے محبت ہے
اگر بخشو خطا میری تو مَیں بھی آج ہاں کر دوں

زباں بندی کے بندھن کو ذرا اب ہٹا دو تم
ہے دل کہتا تمہا ری جا یہاں کر دوں وہاں کر دوں

ذرا سا مسکراؤ تم، ذرا سا مسکراؤ تم!
کہ مرجھاتی ہوئی کلیوں کو مَیں بھی گلستاں کر دوں

جسے کہتے ہو تم کوئی تصادم سا ہے نظروں کا
اسی حرفِ تصادم کو کہو تو داستاں کر دوں

دکھا دوں کھول کر زخمِ دلِ بسمل اگر چاہو
خزاں ہم رنگِ فصلِ گل، گلوں کو ارغواں کر دوں

نہیں بھاتا اگر تم کو ہمارا باغ میں بسنا
کہو نذرِ نگاہِ برق اپنا آشیاں کر دوں

یہ سچ ہے کہ مرا دل ہے دلِ ارزاں زمانے میں
مگر تم جو سہارا دو تو مَیں اس کو گراں کر دوں

بہت اچھا فغاں کرتا نہیں مَیں درد سہتا ہوں
سلگتی آگ کو لیکن مَیں کیسے بے دھواں کر دوں

مجھے ڈر ہے کہیں اے فیضؔ وہ رسوا نہ ہو جائیں
کبھی جو بزم میں ان کی مَیں آہِ ناگہاں کر دوں

○

تڑپایا میری جاں کو غمِ روزگار نے
دل کو جلایا آتشِ ہجرانِ یار نے

کیا کیا نہ ہم پہ گزری محبّت کی راہ میں
کھائے ہیں کتنے زخم دلِ داغدار نے

بتلا سکی نہ رازِ محبّت مری زباں
ہر چند کہہ دیا مرے اشکوں کے تار نے

دردِ فراق، خونِ جگر، آہِ نارسا
کیا کیا دیا نہ ہم کو تمہارے پیار نے

آلامِ روزگار سے گھبرا گیا تھا میں
مجھ کو سنبھالا رحمتِ پروردگار نے

میں پا سکا نہ اپنی ہی منزل کا جب پتہ
کی رہنمائی نقشِ کفِ پائے یار نے

دیکھا ہے لاکھ بار بہار و خزاں کا دور
"اِس مرتبہ تو آگ لگا دی بہار نے"

○

لطف الرحمٰن محمود

بیادِ مکتب

(سات سال بعد گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ کو دیکھ کر جہاں میں نے طالب علم کی حیثیت سے اپنی زندگی کے پانچ انتہائی خوشگوار سال بسر کئے)

(مکتب سے)

اے مرے مکتب میں آیا ہوں زیارت کے لئے
تیرے بام و در کی اُلفت کھینچ لائی ہے مجھے
عمرِ رفتہ کا تصوّر آگیا ہے سامنے!
بیٹھے بیٹھے بھولی بسری یاد آئی ہے مجھے

کتنی پُر عظمت ہیں تیرے بام و در کی رفعتیں
آہ ہی ہیں یادِ ماضی کی بہاریں جھوم کر!
ہو اجازت تو میں آؤں آج پھر آغوش میں
سر جھکائے، دل کو تھامے سنگِ در کو چوم کر!

اے زمینِ مدرسہ! اِک اِک شجر کی شاخ کو
اپنے خونِ ناب سے نمناک کرنے دے مجھے
چومنے دے آج مجھ کو اپنی ہر اک خشت کو
ہجر کے پردوں کو یکسر چاک کرنے دے مجھے

تیرا ہر ذرہ ہے میری آنکھ کا تارا ہنوز
تیرا ہر کنکر مری دانست میں اِک طُور ہے
آج بھی نازاں ہوں تیری خاک سے نسبت تو ہے
رُوح یہیں رقصاں ہے گو یہ جسم تجھ سے دُور ہے

(حضرات اساتذہ کرام)

وہ مرے رہبر، مرے مُحسن، مرے مشفق بزرگ
جن کے قدموں پر کروں سو بار گر یہ سر فدا
جن کی خاکِ پا بناؤں سُرمہ اپنی آنکھ کا
پھر بھی بدلہ جن کے احساں کا نہیں ہوگا ادا

ہاں وہی احسان کے پیکر مجسّم حُسن و خُلق
جن کے درسِ عزم و ہمت نے مجھے بخشی جِلا
جن کی آغوشِ محبت میں رہا میں شادماں
یاد آئے گی ہمیشہ اُن کے چہروں کی ضیا!!

ڈھال کر کردار کے پاکیزہ سانچے میں مجھے
دردبخشا، خدمتِ انسان کے قابل کیا!
زندگی گویا مری اِک تیغِ زنگ آلود تھی
آب دی اس تیغ کو غارتِ گرِ باطل کیا!

مجھ کو سمجھایا مآلِ قیصری و خسروی
مجھ پہ واضح کی گلیمِ فقر کی تقدیس بھی
مجھ کو گرویدہ کیا یثرب کی خاکِ پاک کا
روند ڈالی اِک نظر میں غرب کی تلبیس بھی

وقت کے لمحوں کی عظمت میرے دل پر نقش کی
فرض کے احساس کی دولت عطا کی آپ نے
آسمانوں کے ستاروں کو جو لائے دام میں
وہ ارادہ اور وہ ہمت عطا کی آپ نے

مجھ پہ واضح کیں رموزِ دہر کی گہرائیاں
مجھ پہ افشا کر دیا رازِ ضمیرِ کائنات
مجھ کو سمجھا کر مقامِ بندگی کی رفعتیں!
پیدا کر دی خونِ دل میں گرمیٔ سوزِ حیات

توڑ کر میرا سکوتِ لب سرِ "بزمِ ادب"
ایک شرمیلی سی جاں کو نطقِ اعرابی دیا!
بھر کے سینے کو مرے پھر بجلیوں کے سوز سے
ناتواں سے قلب کو اندازِ سیمابی دیا!
وادیٔ "علم و عمل" کے شہسواروں کے گروہ!
یاد کرتا ہوں ہمیشہ آپ کے احسان سب
آپ پر ہو میرا جسم و جان و دل سب کچھ فدا
سوچتا ہوں کس طرح نکلیں گے یہ ارمان سب

(ہم مکتب ساتھی)

وہ مرے ساتھی - مرے ہمدم - مرے ہم مکتب نشیں
جن کے سینوں میں فروزاں تھے محبت کے چراغ
کتنا دردانگیز ہے یہ انقلاب اے چشمِ تر!
بن چکے ہیں آج وہ خود سینۂ بریاں کے داغ

زندگی نے اپنے دامن میں چھپایا ہے اُنہیں
مدّتیں گزریں کہ ہیں مانوس چہرے مستتر
کاش رُک جاتی کہیں یہ گردشِ افلاک ہی
کر دیئے ہیں وقت نے مالا کے دانے منتشر

چرخ کی گردش کا شکوہ کیا کہ یہ دُنیائے دُوں
اِک سرائے ہفت روزہ ہے مسافر کے لیئے
آج اے محمودؔ پھر تُو مانگ لے اُلفت کی مے
اِس مقدّس میکدے سے اپنے ساغر کے لیئے

(حرفِ دُعا)

ہے دُعائے دردِ دل اے مادرِ علمی یہی
تیرے گہوارے سے نکلیں پھر کلیمؑ و عیسیٰؑ
تیرے پھُولوں سے معطّر ہو فضائے شرق و غرب
تیرے غنچوں کو میسّر آئے بطحا کی نسیم!

تیرے بچے رہبری اقوامِ عالم کی کریں
ماہ و انجم اُن کی گردِ کارواں ہو کر رہیں
ہوں وہ خاکی پر ملائک کو بھی اُن پر رشک ہو
ہوں تو ہمرنگِ زمیں پر آسماں ہو کر رہیں

تا ابد جاری رہے دَورِ شرابِ معرفت!
ساقیانِ میکدہ ہر دم رہیں ساغر بدست
علم کی مینا یہاں شام و سحر رقصاں رہے
واردانِ میکدہ ہوں بادۂ اُلفت سے مست

آسمانِ مدرسہ کے یہ کواکب، یہ نجوم
جن کی نورانی شعاعوں سے منوّر ہیں دماغ
اے خدا اس کہکشانِ نور کے فیضان سے
اس حرم کے طاق میں روشن رہیں ہر دم چراغ

عابد ربانی

کسی سے آجکل میری ملاقاتیں نہیں ہوتیں
یہی کہہ لیجئے کہ دل کی باراتیں نہیں ہوتیں

دکھاتے کیا ہو مجھ کو چاندنی کے ریشمی گیسو
بغیر ان کے یقیناً چاندنی راتیں نہیں ہوتیں

دلائے نہ ہمیں احساسِ فوقیت کوئی ناصح
کہ جن میں پیار ہو ان میں کبھی ذاتیں نہیں ہوتیں

مجھے کیا پوچھتے ہو تم، محبت کا مزا کیا ہے
بغیر الفت کے میٹھی میٹھی سی باتیں نہیں ہوتیں

ہمارے پاس آنسو، سسکیاں اور تلخ آہیں ہیں
علاوہ ان کے اہلِ دل کی سوغاتیں نہیں ہوتیں

ارادہ کر لیا عابد یہ کیوں ترکِ محبت کا
محبت میں کبھی ایسی خرافاتیں نہیں ہوتیں

AL-MANAR

OCT., NOV., DEC.,
1964

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE
MAGAZINE

يا ايها الذين آمنوا اذا لقيتم فئة فاثبتوا وا ذكروا الله كثيـراً لعكـم تفلحـون .

و اطيعوا الله و رسولـه و لا تنازعوا فتفشلوا و تـذهب ريحكم و اصبروا ان الله مـع الصبرين .

O ye who believe ! when you encounter an army, remain firm, and remember Allah much that you may prosper.

And obey Allah and His Messenger and dispute not with one another, lest you falter and your power depart *from you*. And be steadfast: surely, Allah is with the steadfast.

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College

RABWAH

Oct., Nov., Dec., 1964

Editors

RIFATULLAH KHAN

NAEEM OZMAAN

CONTENTS

1. Editorial ... 1

2. The Need of Religion ... 4
Prof. Basharat-ur-Rahman M.A.

3. A Bright Jewel ... 9
Rafiq A. Akhtar

4. Literary Absurdities ... 12
Dr. Muhammad Ramzan

5. Modernisation Leads to Evil ... 14
Ataur Rahim Hamed B.A.B.Ed. (Old Student)

6. The Humour Box ... 16

7. Is Modernisation an Evil ... 18
I. H. Qureshi

8. A Queer Incident ... 21
Naeem Ozmaan

9. A Cry Over Spilt Milk ... 26
Khalilur Rahman B.Sc. Part II

10. The Role of Muslims in Chemistry ... 30
Munawer Ahmad B.Sc. Part II

11. Teddy Paisa ... 33
Saeed Anjum B.A. II Year

12. Umoja ... 35
Naeem Ozmaan

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah, and Published by A. R. Junaid Hashmi for Talim-ul-Islam College, Rabwah.

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

Vol. XIII	Oct., Nov., Dec., 1964	No. 4

Editorial

Al-Manar is at last in your hands. This time we are quite late and we are really sorry for it. But regretfully we have to say it was not our slackness, but rather non-co-operation of the students which caused this un-necessary delay. Al-Manar is your Magazine and without your co-operation and help we can not bring it up to your expectations. If you do not take interest in it and do not take pains to write for it this Magazine will never be able to fulfil its functions properly.

The year 1964 has passed and we possibly cannot refrain from saying a few words about 1965. The New Year has

brought with itself all sort of hopes and desires both to improve ourselves and the world around us. But hoping and desiring without any effort to make the desire a reality will bring out no results. Remember to achieve high ideals you should attach the greatest importance and give highest priority to your studies. Study hard, utilise every minute of your College life usefully so that you may prove yourself worthy of being students of Talimul Islam College which was established to make us true Muslims and enable us to participate more actively in all aspects of Religious, academic, social, political and Economic life of our nation.

TUTORIAL SYSTEM

This year the College has introduced a new Tutorial system. Its main constitution is that the College is divided into twenty groups and each group is placed under the charge of a tutor who is a member cf the College Staff. Prof. Basharatur Rehman M.A. bas been appointed as the Chief Tutor by the Principal.

The main aim of the tutorial system which was also the main aim of the foundation of Talim-ul-Islam College is to inculcate moral and religious values among the students. Our College is not founded to impart merely secular education but also to teach our students at least the fundamentals of Islam and create love for their respective religion Besides getting B.A. and M.A. degrees of secular education, it aims at spiritual progress too.

Personal contact with the students is another aim of our new Tutorial System. Every Tutor is considered to be a kind of a parent for the student. The tutor is the guardian of the students in the college and has to look after progress in all spheres, academic physical, moral and spiritual. The tutors are expected to inculcate all these values among the students by means of ingenious suggestions, polite admonitions and valuable

pieces of advice. The students are expected to act upon them with sincerity of heart and will.

The new tutorial system is in a way quite different from the 'Proctorial System' which represents the maintenance of discipline and the defaulters are dealt with by means of fines and other punishment. But the tutorial system aims at maintenance of descipline by one's heart's consent. It wants to conquer the hearts in a polite manner.

We sincerely hope that all the students will co-operate with their tutors and endeavour to reform themselves morally and spiritually so that the dreams of the builders of the new Tutorial System may materialize.

believed that there is one God who had created them and admonished them to live peacefully, they would never have done so. The fear that He will reprimand them for their transgressions on the Day of Judgement must have checked their hands. Thus only, the breach of difference can be engulfed and the two blocks can come closer to each other and need of the hour is to believe in the True Religion.

2. RELIGION PURIFIES THE HEARTS INTERNAL AND EXTERNAL EVILS :

By nature, man is inclined to baser cravings unless he is controlled by certain laws and commandments. That is why governments make laws so that the wickedness of the wicked may be checked. But this is only a partial check and the criminals find out many means of escape from legal punishment. Police exists, no doubt, but even then there are robberies, massacres, abductions etc. Thus all such checks, fail to have the desired effect. It is religion alone which provides a comprehensive code and puts an end to all evils. A man who firmly believes that there is a God Who keeps watch over him and in whose pleasure lies the success and in whose disobedience is his ruin, cannot dare to commit evils because God forbids to do so. Worldly codes cannot reform a man. It is religion which really reforms because it rules the heart as well as the body and its followers feel an inner delight in obeying the Commandments of God. Religion does not demand only that we should not commit evils openly, it asks us to purify our will, our motives and our heart, too. If we intend to do some evil job, but due to some outward fear, we are withholding ourselves even then we are culpable before God Who says :

ان تخفوا ما فی انفسکم او تخفوه یحاسبکم به الله

i.e., whether you disclose what is in your minds

Prof. Basharat-ur-Rahman M.A.

The Need of Religion

Religion generally means 'a path'. Accordingly every man following a particular way of life and a special ideology, has a religion. But in reality, religion is only that which claims that it is from God and stands for the guidance of human beings.

Religion is an essential thing for mankind but materialists of today are reluctant to profess any religion. The obvious reason is that all religions impose certain restrictions on human activities and these people want to get rid of them. They want to enjoy and indulge in the baser pleasures of flesh, maintaining that religion was necessary for the uncivilized, illiterate and uncultured people of the past, and now that man has advanced in every aspect, he does not need any religion. Moreover, they say, it is foolish to waste one's precious time in pursuit of religion in the modern atomic age.

Now if the indispensability of religion is proved, all such objections stand refuted. Let's see whether the world really wants a Revealed Religion and whether it can solve human troubles. The following facts shall amply testify to the need of religion;

1. MAINTENCE OF UNIVERSAL PEACE & BROTHERHOOD

Today the world is split into two hostile blocks having different ideologies—the Communists and the 'free world' Both are ready to fight over this difference. Had they

believed that there is one God who had created them and admonished them to live peacefully, they would never have done so. The fear that He will reprimand them for their transgressions on the Day of Judgement must have checked their hands. Thus only, the breach of difference can be engulfed and the two blocks can come closer to each other and need of the hour is to believe in the True Religion.

2. RELIGION PURIFIES THE HEARTS INTERNAL AND EXTERNAL EVILS :

By nature, man is inclined to baser cravings unless he is controlled by certain laws and commandments. That is why governments make laws so that the wickedness of the wicked may be checked. But this is only a partial check and the criminals find out many means of escape from legal punishment. Police exists, no doubt, but even then there are robberies, massacres, abductions etc. Thus all such checks, fail to have the desired effect. It is religion alone which provides a comprehensive code and puts an end to all evils. A man who firmly believes that there is a God Who keeps watch over him and in whose pleasure lies the success and in whose disobedience is his ruin, cannot dare to commit evils because God forbids to do so. Worldly codes cannot reform a man. It is religion which really reforms because it rules the heart as well as the body and its followers feel an inner delight in obeying the Commandments of God. Religion does not demand only that we should not commit evils openly, it asks us to purify our will, our motives and our heart, too. If we intend to do some evil job, but due to some outward fear, we are withholding ourselves even then we are culpable before God Who says :

ان تخفوا ما فی انفسکم او تخفوه یحاسبکم به الله

i.e., whether you disclose what is in your minds

or keep it hidden, Allah will call you to account for it''. (2 : 285)

Thus religion says that a man who breeds evil passions in his mind has fallen into evil ; so he should offer repentance for his sins to God otherwise he will go astray from Him and suffer grievous punishment. The fact is that if religion if effaced from the world, goodness will also vanish. The social ills of modern civilized countries are the dire consequences of the fact that they have left the worship of God, their Creator, and fell into the lowest depth of moral degradation.

3. RELIGION IS A RAY OF HOPE FOR EVERY INDIVIDUAL :

Very often we see that the doors of progress are closed for a physically disabled person. He feels himself helpless and disappointed. But there comes the religion to his rescue. It says that if such a man has noble ideas, pure sentiments and earnest desire for godness, he is the most honourable man before God Who says :

ان اکرمکم عندالله اتقاکم

i.e., Surely, the most honourable among you before God is the most righteous. Allah does not see towards your countenances ; he looks towards actions. If the actions of a person have a pious motive behind them he shall be blessed and honoured by God, even if he is degraded in the eyes of worldly men. What a noble message of hope !

Even, if we admit, for the sake of supposition, that it's a mere freak of fancy, even then mere fancy can turn the tables. If a poor and disabled person comes to believe firmly in this message of religion, will not he become the happiest man in the world ? What we need is contentment and peace of mind, for which many a man has committed

suicide. It's a fact that peace of mind does not depend on worldly wealth and position. On the other hand, it is based on the acquisition of the beloved and it is religion alone which presents the most beautiful picture of a flawless and Everlasting Beloved. Moreover, it gives a hopeful message to every individual to find out his Beloved and have communion with Him.

Religion is an everlasting truth. People have seen miracles wrought by religion. It's a sober fact of history that a poor and helpless person would stand against heavy odds but his faith in religion won him the day and God always helped him. This is pointed out in the Holy Quran thus :

وله ما فی السموات والارض وله الدین واصبا افغیر الله تتقون

i.e., It's God alone in whose possession and control is everything found in the heavens and the earth. True religion has always belonged to and emanated from Him and by overpowering the world by mighty signs and miracles, He has always been presenting a living sign of His omnipotence. And the true religion which gave peace and tranquillity to the world has always come from God. What has happened to you that you are denying his Being even after, so many clear signs and you are considering other beings as the source of succour and rescue for yourself.

Thus it is manifest that human beings always got peace by dint of religion alone because it presents to us, a noble ideal for our lives, and after purifying our character and enhancing spiritual values, bids us to gain our real goal — to have communion with God. And he who succeeds in doing so gets eternal peace from tortuous affairs of mundane world.

ESTABLISHMENT OF A CLASSLESS SOCIETY

From times immemorial, class struggle is going on

in the world. The upper strata in society has always struggled to dominate the others. In the twentieth century this conflict of interests reached its apex and as a re-action to Western capitalism, Communism appeared in the world. But these are the two extremes; religion, on the contrary, presents a golden mean.

All human beings are equal in the eyes of God — a capitalist as well as a labourer — So His teachings manifested in religion can never be harmful to any one. Allah, the Great, says in the Holy Quran:

'O ye human beings, Allah has taken the responsibility of guiding you to the right and golden path because the prevalent religions have become preverted. He does not compel you, so that you yourselves may search for the path of real peace and progress; but for this, you would have become human machines. Had He wished so, he would have given you righteousness compulsorily. The difference of religions is only because of this free choice. But let it be clear to you that a rel'gion, pure from extremes, can only be sought from a Messenger of Allah.

History proves the fact the messengers of God always gained popularity in the long run due to their unexempalary character and selfless sympathy for human beings. They became the torch-bearers for the high and the low, for the rich and the poor and they linked them with the eternal bond of brotherhood. Now a days, too the world wants such a classless society which involves the good of all and this can be done by Religion and Religion alone i.e. Islam because it is comprehensive in all aspects.

May God give our people a mind to understand the necessity of religion and give them enough strength to act upon its exquisite principles. So that peace may reign all over the world:

Rafiq A. Akhtar

A Bright Jewel

SHEIKH AMRI ABEDI
The Most Unforgetable Character I have Met

The reminiscence I recall now painful because of its association with the present, goes back to some ten years ago when my parents had sent me to Rabwah to be admitted in T. I. High School. In the beginning I was put up with a small student from Sierra Leone whose friendship afterwards led to my frequent visits to the Foreign Student's Hostel, where gay faces of many young boys from far off places like Ghana, Kenya and Somaliland etc. helped me consider my own homesickness.

And, then a simple ever smiling figure appeared among them. I very well remember the day when we went to the Railway Station to receive Sheikh Amri Abedi. The moment he stepped on the plateform it seemed we were known and endeared to him for years. I still remember his brilliant face gleamig out of a heap of garlands and without any sign of fatigue even after nearly five thousand miles journey. What was the Rabwah of those days ? Parched ground with a deep frothed crust of saline powder ; hardly any green grass blade to be seen—great labour was being exerted on tne roadside ; Shisham trees were planted to provide some shade———mud wall tenements ; humble poor inhabitants ; every third day-dust storms approaching in the from of solid giant wall extended to the sky. But Abedi became a part of this all. He was often seen walking in the burning sun with a dense deposite of dust powder on the brim of his National cloak, which gave him a unique grace united with that of his noble

simplicity——simplicity of heart, simplicity of every thing, an inexplicable sort of simplicity which made him an extremely amiable being. A friend from Kenya relates that once he had an honour to take meals at his uncle's place along with Mr. Abedi, who then was the Minister of Justice for Tanganyika. He states that on the start of the meals he took up his fork, knife & spoon to cut with them. Thinking Mr. Abedi would use the same. But instead Mr. Abdi looked at him, smiled and started his meals with his hands.

Once when I enquired of him if he felt himself accalimatized to the new, rough environment, his prompt reply was: "Why rough ? How homely are the people ! How lovely the hills around ! I am perfectly cheerful here." And, indeed, there was not a bit of formality in his remarks. He was always seen as cheerful in this dusty town as a blithe nightingale frisking about in a garden being choked with inundation of blossoms.

And, when he spoke in a gathering, his words flowing like a majestic, silvery cataract went on sprinkling an intoxicating magic on the audience. It seemed as some seraph veiled in celestial tanned-glory had descended from heaven and was addressing a collection of spirits. But when they woke up they rushed forth with a pent up enthusiasm to have close glance at him or, if possible to embrace him. I always looked for a chance, being one of his galore admirers. He was still an embodiment of humility.

Abedi's smile that was the wealth of his own charm only, was too stubborn to fade before the most vitriolic stimuli. One after-noon in June, when summer, was at its prime in Rabwah, he was seen coming from the mosque drenched in perspiration. He was smiling ! Then one day I saw him entering the hostel in a heavy rain when hails had just stopped falling, he was smiling ! And this smile that

spoke volumes from the depth of his heart was always seen on his face, as some artist had chiseled it on the lips of his statue to remain there undeminished in the heaviest storms. Piety, God's and His enjoining's over whelming love, angelic virtue and child's innocence were imbued throuhout his physique which distilling up bloomed in the forms of Abedi's precious smile. It is no more to be cherished !

A humble man once living with humble people of Rabwah went back to his country and became first, First African Mayor of Dar-us-Salam, then Comissioner, then Minister of National Development and Culture of the United Republic of Tanzania then Tanganyika. ProvidenceHimself needed him ! A real pearl appeared in the vast ocean of humanity too soon to disappear. Hazrat Khalifatul Masih II, too once mentioned that Ahmadiyyat was by the Grace of God gifted with a precious Jewel like Sheikh Amri Abedı. His most invaluable service to Islam was his great contribution to the translation of the Holy Quran into Swahili, the most widely spoken language of Africa. Indeed his loss is unbearable. Let us hope that our youth would follow his splendid example and provide Ahmadiyyat and Islam with many Abedis to compensate his loss which makes us giddy at its very thought ! INSHAALLAH !

Dr. Muhammad Ramzan.

Literary Absurdities

I learn that the literary demagogues of the underworld do not agree with my Islamic ideas on modern trends in society, viz, woman's role in world affairs, music, dancing, love dramas, love letters, rómantic literature, diabolical debates, poetical symposiums ; in short, every thing that propitiates the gods of carnal desire and sensual passion but has no place for moral and spiritual values, which virtually have been relegated to the limb of oblivion in this age. I am extremely surprised, but certainly not dismayed by their opposition. On the contrary, I am rather glad that they are encouraging me to carry on this sacred task with vigour and enthusiasm. But for this, right could not be distinguished from wrong in this tragic drama.

This is, happily, so from time immemorial and going to be such as long as the forces of evil are arrayed against virtue and righteousness *i.e.* of Satan against God, till the former is entirely extirpated from the earth, as he is doomed to be in the later days at the hands of the Promised Messiah (peace be upon his soul) and his true followers.

If, however, they cannot reconcile themselves with these views, they should at least listen to the inspiring message by Miss Fatima Jinnah :

"You have only to realize and appreciate immense power that lies latent in an organised, disciplined and sensitive public opinion. Look within yourselves, search your hearts, create your own powers by the use of your latent faculties. If you

recapture your soul and galvanise your ideology and your mission, you will be releasing such current of thoughts and actions as can change the entire face of the country and set it on the road of progress and prosperity."

They seem to have harps instead of hearts. But, God willing, I will go along with my peaceful crusade against evil, corruption, inaction, egoistic phantoms etc, till the road to social justice and blissful peace is cleared of all tortuous hurdles.

The yearning soul will then abide in the lap of his Creator and rest in eternal peace. This is the transcendental goal set by the Holy Prophet before us all and re-emphasised by the Promised Messiah of the age (peace be upon them both).

This alone is my life-slogan and this will be my epitaph, INSHA ALLAH !

If, yet, they are at odds, let them apply the therapeutic test to the accruing results and see if the emancipation of human body, mind and soul from age-old shackles of (1) slavery, hunger, want and diseases, (2) fear, superstition and various other utopias and (3) material and irreligious ideas are due to the practical fulfilment of divine comedy ushered in by eternal scheme of things or human tragedy brought by man's interpretation, artifice and goady deeds ? Alas ! they are fishing in troubled waters, feasting and washing their brains while humanity is bleeding.

Ataur Rahim Hamed B.A.B.Ed. (Old Student)

Modernisation Leads to Evils

They Say "The Old Order Changes, Yeilding place to New." The cycle of actions and reactions of thesis and antithesis has been going on ever since the world was created. But today we have to see whether the change is for the better or the worse.

For this its better to judge those aspects of life where modernisation touches most and they are machanical, economical and social.

The Industrial revolution paved the way for modern speedy and economical mechanisation but we should not shut our eyes to the evils which have followed in the wake of this upheavel. This was manifested even in those early days when the dazzle and the shine was afresh. The jets have no doubt reduced the distances of the world but can we forget the bombers and the destroyers of the modern air forces ? It is true we breakfast in Karachi and dine in London but can we forget the agonies and the cries of the innocent babies and the widows of Hiroshima and Nagasaki ? The modern means of conveyance have turned Alladin's Lamp into reality but can we forget the hundreds of children and old people and thousands of innocent animals dying daily ? Can we shut our eyes from the pitiable life breathing its last on the road-side ? The atom has been used more for the destruction of mankind than for its protection. The nuclear age has usherd an era of mutual destruction than co-operation. Thus the modern Scientific equipments have been used more in the destructive sense than the constructive sense.

The economical sphere of life has also been invaded by modernisation. The world has been sharply divided into classes The haves and have nots have lead to world wars. The capitalists with all the means of production at their disposal are ever-ready to exploit the labourer to outmost extremities but labour is helplessly looking askance. The Imperialistic designs of the Western Powers manifest themselves in the shape of the European common market and American Economic Aid to the under developed countries. These are the garbs which the wolves have worn to hide their identity and are the direct out-come of modernisation.

The modernistic cataclysm has also not left the social sphere of the life undisturbed. The life of a modern man is a play. He does not know the mystery of life as it has become more and more complex and these complexities have completely ruined the inward peace and the mental satisfaction of the man. The soul of modern man is floundering in the kuagmire of doubt and despair.

The social distinctions based on economic position undesiralble class struggle, lack of definite culture and imitation of other nations are leading the man astray. What are all these? Nothing but blessings of modernisation. If after all these considerations, some of us still persist that modernisation does not lead to evil, I can do nothing but pity such people and quote from the Holy Quran that such are the "People who have eyes but see not, have ears but hear not".

The HUMOUR BOX

Doctor : "What you need is exercise. You should have a little sun and air".

Patient : "Why, I'm not even married".

"My son has just received his M.A." said the proud father to his friend".

"I suppose now he'll be looking for a Ph.D."

"No. now he's looking for a J.O.B."

Aslam : My uncle had an accident with his car. It was a terrible accident but he had a good doctor. The doctor told him he would have him walking in 9 months."

Majid : "And did he"?

Aslam : "Yes when the doctor sent his bill, my uncle had to sell his car".

Professor : "Don't you know the difference between ammonia and pneumonia?"

Medical Student : "Sure, one comes in bottles and the other in chests".

Hamid : "What's the difference between a single man and a married man?"

Khalid : "A single man has no buttons on his shirt, and a married man has no shirt.".

Student : "I want to buy a pencil".

Shop-keeper : "Hard or soft?"

Student : "Hard, it's for a stiff exam."

"Had a tough time raising this mustache.".

"Well, crops are bad everywhere this year".

Lady : "Can you give me a room and a bath"?

Hotel Clerk : "I can give you a room, madam, but you'll have to take your own bath".

Small Girl : "My brother has a new invention and it's very practical, too".

Small Neighbour : "What is it ?"

Small Girl : "He makes chickens swim in hot water so they'll lay hard boiled eggs.

KINDNESS

- Kindness is the master key to all locks on barred hearts.
- Kindness is the chief foreman in the shop of good works.
- Kindness is a jewel from mines of heaven.
- Kindness is the mother of confidence and happiness
- Kindness widens the circle of friendship, and has "thank you" written all over its face.
- Kindness fans the sparks of worthy motives, and smothers out flames of evil desires.
- Kindness places a sun in somebodys sky, and stations a full moon for the blackness of their night.
- Kindness receives its rewards both here and hereafter.
- Kindness is the eraser on the pencil of endeavour.

I. H. Qureshi

IS MODERNISATION AN EVIL?

One must not become too pessimistic to take it for granted that modernisation is as abhorable a thing as may be imagined. Everything involves good as well as bad points in it ; it is human instinct that matters to discern good out of evil. For instance even a rose has thorns. Now if a man plucks thorns instead of flowers, what is the fault of the plant ? Similar is the case of modernisation which is not an evil in itself. The proposition that modernisation leads to evils is nothing but the vain exposition of man's frustration. Let's weigh its pros and cons and try to reach a matter of fact of solution.

By modernisation we mean all the things associated with development of modern man in material domain. Modern modes of living, scientific discoveries and their applications for raising the standard of modern man come under this head. In the light of this let's see whether modernisation creates evils.

One may be passionate enough to cite the horrible destruction wrought by atom bomb at Hiroshima and Nagasaki but one must not shut one's eyes ostrich-like from other useful services being rendered by the same atom in surgical, agricultural and other fields. It is Science—-the hand-maid of modern man-————which has made their life so convenient. One lifts the receiver and hears the voice of his dear-ones ; soars on high altitudes ; floats swiftly on the billowy ocean ; goes deep into it ; sees and hears a person speaking far, far away.....thousands of miles away, locates and silences a

hidden but roaring gun ; types words from as away as he may choose ; sees an enemy lying hidden in trenches quite clearly ; can observe stars in the remotest parts of the high heavens ; can aspire to visit planets and the moon ; can drop himself down safely from thousands of feet above the ground and can hope for cure from fatal diseases. A few days ago a surgeon has been able to restore eyesight to five or six blind boys. Aren't all these the off-shoots of modernisation? It's due to modern modes of living that life has become more convenient to live in. Thus modernisation far from being an evil, is a blessing.

The next most important point which we must consider is whether life in the past was free from evil. If it is proved that mankind was totally free from evil throughout in the past, we will unhesitatingly admit that it is modern civilization which has led the man astray. But is there any substantial evidence to this fact? Mere vain slogans are not enough. The whole evidence of history goes against this and it is crystal clear that evil did exist at all times——the millenium was never reached. A few centuries back, when feudalism and absolutism reigned supreme, many a Nero carried fire and sword wherever they went and the sacred blood of mankind flowed in torrents. The pages of history are stained red with such heart-rending events of carnage. Malicious tendencies have always existed in the mind of man and if they continue to exist even now, what is the fault with modernisation ? Fighting there was in plenty; fighting there is in abundance. Neither the past generation was absolved of evil, nor the present. Then why should we have so much prejudice against modernisation ? This approach to modernisation is altogether wrong. The fact lies somewhere else.

The crux of the problem lies in the need for purifying the inner depths of our hearts. Whenever there is any issue of power-politics, feelings run high and the conflagration of hot

or cold war goes on spreading farther and farther. So man must overcome his baser self and relinquish malign ambitions. Unless the slogan of universal brotherhood and equal rights becomes a reality, evil cannot be effaced from the surface of the earth.

To sum up, man must reform himself first and put lofty ideals into practice. There is nothing bad in making the most of modern scientific inventions and other modes of living. But one principle mustn't be lost sight of and that is to assimilate good and avoid evil. The Holy Prophet has also pointed out:

'Adopt what is purified and shun what is not.' So if we keep this principle in view, we would never condemn modernisation. We must change the notion that modernisation breeds evils because there is a silver living even in the darkest clouds. Leave the past, make the present worth-while and think for the future!

Naeem Ozmaan (African)

A Queer Incident

It was a dull hot afternoon. The temperature was over a hundred degrees and the room was as hot as a boiler. Thirty students were made to sit in the room and do private study for the Cambridge School Certificate Examination, which was very near. Our teacher Mr. Nut was sitting in his chair on the stage and an atmosphere of Martial Law prevailed in the class. There was pin-drop silence in the class and it had to be the same for the next two hours.

After the first half hour our teacher thought of something and left the class in utter silence. Just then a student named Witty stood up, and broke the silence in these words, "Hey chums! Aint you all getting bored by sitting in this silly class in silence for so long?". "Yes. we are," "came the answer from the class. At this Witty said; "Then why not have a hot party to-day? Come on and let's have some fun." So the fun and the hot party started with some jokes and later jumped on to songs. Within a few minutes the party was really 'hot'. Every student was absorbed in the hot party and completely forgot the class room. There was fun. Real great fun! But not for long, for after a short time Mr. Nut appeared on the door and questioned in a commanding voice, "What is all this fuss about? Do you think this is a fish market or something of the sort"? Every body got pale and Mr. Nut was red with rage. Take your seats, you all", he commanded.

At this the students took their seats trembling with

fear and expecting the worst to come. Returning to his seat Mr. Nut gave us a good long lecture on etiquettes of the class-room and the responsibilities of the students and at the end announced : "Seeing that none of you realises his responsibilities, I have decided to detain you all for three extra hours, after school time until the Cambridge Examination day".

There was a low moan in the class and one student stood up to protest but was made to sit down by Mr. Nut's addition, "If any one tries to protest or prove his innocence I will increase the time." Everyone knew it was useless to protest, for Mr. Nut's decision was always final and Ceaser's Seal. So we got ready to experience our three hours extra detention for the next four long months.

We experienced these torturing and tiring two and a half hours compulsory and three hours of extra study periods for over a week. And every evening each student went home with a thousand lines imposition to write. We were let free at 7.30p.m. and reached home late in the night. The worst of all was that we could never sleep before 2 a.m. and the next day at school everyone felt sleepy and tired in the class and the other teachers reprimanded us for laziness.

This was too much for us. We felt this calamity like a thunder-bolt from the sky. All students prayed to God that He might avert this calamity. As good luck would have it. One day a drunkard Native African appeared on the scene.

He stood near the window where Witty was sitting and started shouting. Mr Nut asked Witty to request the African as to what he wanted and why he was disturbing the class. After inquiring of him Witty told Mr. Nut that the African had lost his wife and she had come that way. So he wanted to know if anyone had seen her and could be of any help.

Mr. Nut asked Witty to tell the African to go away with his 'Albi' and not disturb the class. Suddenly it struck Witty that Mr. Nut who had only two months ago come from Europe did not know Swahili language and it was understood that the African did not know English. Thus Witty tried his luck, bearing bright consequences in his mind, Witty appointing himself as an interpreter between Mr. Nut and the African and started his venture in Swahili and the conversation ran thus :

Witty to African : Our teacher says that he has got your wife here and because you have treated her badly he would not return her.

African : Does he say that. These whites have robbed us of our Mother, (it may be noted here that the African mother is their land). and now they will rob us of our wives. We would never tolerate this. Tell him to return my wife.

W to Mr. Nut : Sir, the African says that he has seen you hiding his wife in the class and asks you to return her.

Mr. Nut : Tell him that I haven't got his wife. Ask him to go away from here.

W to A : Our teacher says that on no grounds is he prepared to return your wife as he too is in need of one.

African : Then tell him if he does'nt return her, I will make him do it. I am not going from here without my wife. Either I take her with me and kill the European or get myself killed.

W to Mr. Nut : Sir the African says that you would either have to return his wife or have a Single combat with him.

Mr. Nut got angry and worried and said, "Tell the Silly African I don't have his wife. You know I don't. So ask him to go away as I don't want to 'FIGHT' otherwise I will call the 'POLICE'.

The African though illiterate, understood FIGHT and Police and inquired, "Did he say he would fight rather than return my wife or I should report to the police."

Witty : Yes he said that.

African : "Well the police is of white people. It would do us no justice. So I will fight him. "And he started. Removing his big dirty great coat and drawing out his long knife from his pocket he started to enter the class through the window. At this Mr. Nut jumped through the opposite window of the class room and rushed home in his beautiful black and white Ford-Falcon. the girl students started crying and shouting with fear. The situation was brought under control by Witty and some others who sent away the African, remonstrating him with polite words.

Next morning at school, during Mr. Nut's English literature period, most of the students were expecting a hard time and the most worried of all was Witty as one girl student who was about to faint with fear the day before threatened to tell the truth to Mr. Nut. But destiny was favouring Witty. As soon as Mr. Nut entered the class he asked Witty of what happened after his departure. Witty replied, "Sir, we had great difficulty to bring the situation under control. But before the African went away he swore that he would visit the school henceforth at 5 p.m. and shall not rest in peace until he killed you for you had threatened and abused him."

Mr. Nut then said, "I am very thankful to you all and specially to Witty for saving my life yesterday. And because of some personal reasons I have decided to relieve you from the extra detention. I am sure you would realise your responsibilities and not waste any more time. So from today onwards you will not have to stay here for the extra three hours.

To this sologans of *'Uhuru na Bwawa Nut'* meaning *Freedom* and Mr. Nut were raised. On inquiry as to what it meant Witty replied, Sir, it means, LONG LIVE MR. NUT. Mr. Nut smiled and thanked the students. So we were free again. No more tiring detention after that. But from that day we resolved to study and study hard and made our new motto "UHURU NA KAZI".

FREEDOM AND HARD WORK.

Khalilur Rehman B.Sc. Final.

A Cry Over Spilt Milk

(A short Play)

Characters : A staunch.

Zubair : pagon of 45.

Lubana : His wife (Now pregnant)

SCENE. I.

(*It's summer in the early days of Islam. It is the sitting room, in Zubair's house. Some palm-dates and a cup of water is lying on the table near the back wall. One lion skin and two deer skulls are also seen connected to the back wall. An odd sword is hanging near the skin. Lubana is sitting near the entrance. Zubair enters, fully armoured and buckling his dagger belt.*

Zubair : (*hastily*) Did you hear any clip clap of horses passing by ?

Lubana : Yes, I did, but I to by all this hurry ? You were to assemble at evening. But it's hardly after noon yet.

Zubair : (*excitedly*) Yes, but it is our blood, our uncontrolable passions against that ... Muhammad.

(*It seems he did not want to show any ill temper, while parting from his wife.*)

Lubana : I fail to understand the necessity of your fighting against him. He is there in Mecca, a distance of six miles from here.

Zubair : (*Solic tingly*) Poor woman, don't you understand? These are the traditions, the customs of our race for which we fight.

Lubana : Still it does not concern us.

Zubair : (*angrily*) Why! it does. He says, "We should not gamble, should not bet, should not worship our gods; and ..... and should not kill our daughters.....

(*He pauses, as though some strong idea had struck his mind, Yet he continues*)

.....Say what you propose to do if the child born should be a girl.

Lubana : (*alarmed*) You yourself will be present.....

Zubair : (*interrupting*) I don't know how many days I will be away. We should decide about her fate just now.

Lubana : Certainly, we should keep her, our first child.

Zubair : (*infuriated*) What.....?

Lubana : (*appeasing him*) First born should not be killed ..... an ill o en. My father did not, when I was born.

Zubair : (*shouting*) I won't.....!

Lubana : (*calmly*) He did not, and you have a wife. If all should kill their daughters, to whom...

Zubair : Your father had no honour, there are others who don't have. I won't have it! A son-in-law is an abuse to my family.

Lubana : You are abusing my father aren't you?

Zubair : (*continuing*) A female must be killed! But how? Will you choke her, cut her throat, or bury her alive. Ccrtainly a bad luck!

Lubana : (*very pale and burts into tears*) I shall keep her till you return.

Zubair : (*shouting*) No ! An alive girl never be in my house. (*slowly*)

You should cut her throat.

(*She faints, and Zubair sprinkles some water on her face, airs her face with a palm leaf. She stirrs and opens her eyes*).

You will cut her throat. Agreed !

(*The curtain falls*)

SCENE II.

It is autumn. It is the same room and same furniture. Lubana is seen sitting away from the door, absorbed in thoughts. Horse beats first heard from a distance, are coming nearer.

At last the Foot-steps stop. Zubair enters, looks astonishingly at his wife's countenance, goes to her and embraces her.

Zubair : (*tenderly*) Dear wife, you can't imagine how longingly have I waited for this moment.

Lubana : (*looks pleased, yet her eyes show no light*)

Lubana : No one returned here to tell me any news. I was afraid of you.

(*Zubair looks about him, with eyes wide-open so that he may find some new object. But he is disappointed.*)

Zubair : (*In heavy dry tone*) They will never return ;

Lubana : All of them are dead. Our child was a girl (*listlessly*).

Zubair : (*hopingly*) I don't believe you killed her. You are too kind !

Lubana : (*Dejectedly*) But. I did.

Zubair : (*expecting a favourable reply*) No. You gave her to some Muslim family. You musn't tell lie before me.

(*She is surprised at his sweet tone and nice behaviour*)

Lubana : I swear, I did.

Zubair 'chokes and feels as if some vital part of his body were hurt. tears drop out of his eyes. He stumbles. Lubana not understanding puts out her arms for him.

Lubana : What's the matter ? Why so ?

Zubair : (*weeping*) I ..... I ..... accepted the teachings of Muhammad ..... I am ... a ..... Muslim now.

(*Her arms around him*) I did the same, but it's too late.

(*Both weep.*)

The curtain falls.

Munawar Ahmad B.Sc. Part II

The Role of Muslims in Chemistry

Chemistry as Science is not yet three centuries old and the practical operations out of which it grew were those in the field of Alchemy. The Chief torch-bearers of Alchemy were early Muslims. The words Alchemy and Chemistry are derived from Arabic word *"ALKIMIA"*. Western alchemy was almost entirely a direct legacy of Arabs. At the time of the rise of Islam, alchemy was already an art of venerable age. It was in this period that Muslims prepared the way for modern chemistry by the discovery of new substances, particularly the mineral acids and various Chemical processes which are now the backbone of the present highly industrialised society.

The knowledge acquired by Arabs was gradually handed over to the European people during the 13th and 14th centuries and the alchemists hardly known in the Western world before this time become an important figure. The art al-chemy in early Muslim period was of a dual character, embarking specialized portions of metallurgy, dyeing and similar crafts and on the other hand Islamic scholars amalgamated alchemy with medicine for various types of treatments.

Under the caliphate of Haroon-ur-Rashid and Mamoon-ur Rashid big academies and observatories were set up and chief scientific works from other languages were translated into Arabic. The first Muslim to interest himself in the art of "Kimia" was Khalid Ibn-i-Yazeed, a son of royal house whose alchemical works are still in existence.

The greatest name in the field of Chemistry is that of

Gaber-ibn-Hayyan. He was the son of a druggist of Kufa and lived in the period of Caliph Haroon-ur-Rashid. He clearly recognised and emphatically stated the indispensability of experiments in Chemistry and his books contain plainly recorded description of experiments which show him to have been a capable research worker and a keen observer of Science.

On the constitution of matter, Gaber held the old conception of four elements *i.e.*, fire, air, water and earth but later on he developed his own theory on different lines. In his "Book of Seventy" he postulated the existence of four natural elements, namely hotness, coldness, dryness and moistness, He elaborated the sulpher-mercury conception of the constituents of metals—— the earliest chemical theory. Similarly the modern art of reduction, sublimation, crystallisation are all attributed to Gaber. Of the mineral acids he developed nitric acid, and prepared aqua regia for dissolving gold to separate it from impurities.

Second only to Gaber amongst the Chemists of Islam was Ar-Razi. His name was Abu Bakr Muhammad bin Zakiryya, commonly known as Ar-Razi, the man of Raysy from his birth place al-Ray near Tehran. He lived from 836 to 925 A.D. His known and acknowledged contribution to Chemistry was his systematic classification of Chemical substance. He was also one of the greatest Physicians of Islam and his works on medicine are still highly applicable. His book "Kitab Sirrul Asrar" has been translated into several languages. His most important work was "Al Hawi" the first translation of which appeared in 1279. His book forshadows laboratory manuals and there are experimental details that Razi had done himself.

From the list of material and apparatus, it is evident that his laboratory was well-equipped with beakers, flasks, candle lamps, hammers, sand baths, water bath and filters of hair cloth etc. He also gives detail about the construction of more complicated pieces of apparatus from these.

His cup-board contained not only specimen of all metals known then but also malachites, gypsum, galena, borax, common salt, lime, potash, red lead, white lead, feric oxide, caustic soda, cupric oxide and glyceral. He had specialised reagents and chemicals required for various complicated and advanced experiments.

The list of alchemists, with less no contribution in this field, is headed by Ibn-Sina————a person of extraodinary intellectual ability and a prolific writer. He represents the climax of mediaeval philosophy and his works on alchemy received little support as they were much ahead of their times. He disagreed with the conception of earliest workers about the conversion of one metal to another with the aid of elixirs.

An early 10th century work is ascribed to the Spanish Arab, Maslama of Madrid. He also explained cupellation and other methods for the refining of gold and silver.

During the 12th and 13th centuries the transmission of theory and practice shifted from Muslim world to the West, with the result that Muslim scholars were eclipsed by the Western workers but the decline has not been so sudden and great as has been assumed. Various works are being examined in many countries and within a few years to come, the true picture may emerge.

Saeed Anjum B.A. II Year

Teddy Paisa

The day was quite hot and the temperature of my house was high. I was short of money and my pockets were empty. It was Sunday and I was resting at home. My elder child Naseem who was trained to remove the creditors from the door being absent, and my youngest son, who unluckily was at home, kept on telling every visitor of my presence.

To be penniless was no fault of mine. It was right that I had finished my monthly allowance within fifteen days, but I had a good reason for this overspending. The reason was that expecting Rs. 75 for my story I had submitted to a magazine, which paid the said amount to the writers of every story if published. Hoping to receive this amount I had over spent my allowance. But unfortunately instead of a money order I was informed by the Editor that my story was not fit for publication. Being made miserable by the unwelcomed news I had decided to go for a walk but just then my elder son came in smiling and made a sign to me to keep quiet. He later informed me that he had removed three creditors from the door telling them a lie that his father was not at home. Hearing this I decided to abandon my programme of going for a walk and instead, taking a book to read, I asked my wife to prepare a cup of tea for me. After a short time my wife brought me a cup of tea. On inquiring from her as to why the tea was tasteless, she told me that sugar had been finished and she did not have money to buy any. I being penniless did not compel her to try to get some.

I was sitting there reading the book and sipping my sugarless cup of tea when a few friends of mine of whom some were my debters came to see me but unfortunately none of them could be of help to me as all of them were emperors without states.

After a short conversation we started strolling towads the bazaar. I was walking on the extreme left with my hands in my pockets looking on the path. Suddenly I saw a purse on my feet. After some hesitation I picked up the purse and put it into my pocket and started walking towards my friends thinking that God had thrown the purse for me. It did not take long for my friends to notice my bright face and they could not refrain from asking me the reason of my sudden change of mood. We had a little conversation and at the end my friend Naeem who had been watching me from the very be ginning said," Anjum, surely some thing is wrong with you, I am afraid you are going nuts. Better go home and take some rest".

To this I hurried home with a fast and steady pace avoiding over-running the peole in the streets. I reached home nearly out of breath. At home, I nearly ran on to my wife but avoiding her carefully I rushed in the bath-room thinking that if I opened the purse in front of her I would have to share my treasure with her. Opening the purse first I came across a gentleman's Photo and then an invitation card of the ill-fated owner. The card bore the following address "Abdul Karim Cheema, Manager National Bank, Chiniot Branch, Chiniot". The address made me more overjoyed and hoping to find a big fortune from a bank manager's purse. I opened the purse with trembling hands. Having impatiently searched all the pockets, the great fortune I found was a beautiful shining brown coloured TEDDY PAISA.

Naeem Ozmaan (African)

UMOJA

The Key to National Progress.

(Umoja is a Swahili word meaning Unity)

The western powers have made such a tremendous progress within a short time that most of the new emerging nations are dependent upon them. No true patriot likes his country to be dependent upon another. He sees his country depending on the power of another but his true sense of patriotism makes him feel awkward on the thought of his countr's dependency upon some great power. He wishes that his country should be aloof from such a practice but he has a notion that he alone is helpless. Of course, he is right but there is a sure solution to every problem. Nothing is difficult to achieve if it is fought for sinceriely.

The only solution to make a country powerful self-sufficient and respectful is the true sense of Unity. Unity according to the English Dicitonary means,' State of being one or harmony'. It is easier to break one stick than to break a bunch tied together. It is the state of the sticks being together that they are difficult to be broken ; it is their Unity that makes them powerful. Thus we can say, 'Unity is strength ! and to achieve self-respect, strength and self-sufficiency for a country Unity is very essential as it is a Key to National Progress.

It is matter of history that different nations have had their own opinions of national harmony, by means of which they got wealth & Power. Along with the increase of knowledge

the shape of Untiy also changed. To-day different nations have different ways of safe-guarding their possessions and self-respect. For example the four big powers viz. U.S.A. U.S.S.R., U.K. and France have the atom bombs to safe-guard their desires. Thus it is the fear of their power that makes the new nations look up to them with respect. The Western powers, on one hand, are supplying aid to other countries. But this aid is not meant for the benefit of the receiving countries. It is indirectly a flag of the foreign power flying over the country. Similarly on the other hand, the Communist countries are practising the same thing and this is also a foundation stone of building a sky scraper of Communism. Under the banner of Communism one is deprived of the freedom of speech and individual thinking. Thus these aids are not aids in true sense but plant of a foreign tree. These great powers can do all this only because of power and power they got through Unity.

Though most of the emerging nations realise the risk they are running by being in alliance with the powerful nations they cannot help it as they have no Unity, thus depriving them of the power without which a nation is like a man without footings. Some nations have become members of such groups as CEATO and SENTO but these are not free from the influence of imperialism.

Power and Unity are necessary for a country's progress. The nations of the world have formed the U.N.O. but this too has not been as it should have been. The U.N.O. is more or less ruled by the Imperialists and the Communists. The best example we have is the benefit of the 'Veto Power' granted to the big nations. All these ailments have selfish motives.

Pakistan, Iran and Turkey have taken a wise step in forming the RCD, which will always be remembered in

history as a glorious deed. This is one of the very few pacts which is free from selfishness. But this has been done on the will and Unity of the leaders. It is true that the leaders are the representative of the respective nations but the leaders would be helpless without the Unity of the general public. Thus it is the duty of every individual citizen to unite himself under the country's leader.

The formation of Pakistan itself is a good example of Unity. It was brought into being by the Unity of the Muslims of the Sub-Continent when they united their hands under the inspiring leadership of the late Quaid-e-Azam. Though it is divided into two provinces hundred of miles away from each other yet the same flag is hoisted upon both the wings. Languages in both the parts vary after every few hundred miles culture and customs vary, the beliefs differ but inspite of all these differences they are united under the same green flag with a Star and a Crescent. The main thing which Unites them together is their belief in the divine and sacred religion of Islam.

Surely some would ask a question here as to why why Pakistan is still dependent over other countries when it has the Spirit of Unity. The reason of this should be quite clear to anyone who has been keeping himself up to date with the history of Pakistan or the scholars of history. After the death of the Quaid, the spirit of unity among the people was lost. Pakistan experienced instabillity. Leaders strived for their own selfish ends ands and individual strived for leadership. The spirit of national integrity was lost among the people. But thanks to the peaceful revolution of 1958 that Pakistan's destiny was saved and again it was put on to the road of success. Today again Pakistan is progressing and becoming less dependent over other nations. The main reason of this is Unity of people under the leadership of the great army

general Ayub Khan.

Though there are still some people in Pakistan who do not want unity in Pakistan but the public should not pay heed to these blacksheeps as they are like a a needle in a hay stack. This is the time when Pakistan needs the Unity of its people most. She is passing through a very critical time and its destiny lies in the unity and harmony of its people.

Internally it has to fight the social evils of proverty ignorance and dis ease which are few of the worst enemies of the country. It is the duty of every citizen to create such an atomsphere whereby every citizen has the liberty of thought and speech. But these problems cannot be faced without co-operation. Moreover it should be borne in mind that,

> Liberty is freedom to do what you ought
> And not a right to do what you will.

Externally Pakistan has to fight the threatening dangers of foreign aggression especially from India. The world has failed to press India to solve the Kashmir dispute and Pakistan is suffering mainly for being separated from a part of her body. Instead both the Western and the Red-blocks are supplying massive arms aid to India causing a commotion of balance of power in the Sub-Continent. The cunning friends of Pakistan have betrayed her. Knowing that their power has influenced Pakistan they are trying to influence India by supplying them with arms and using the Indo-Chinese dispute as a curtain. India has been clever enough to step off the spiders web and along with Western aid is getting Communist aid also, creating a competition race between the Western and Communist arms aid.

Thus with the betrayal of Pakistan by its friends,

Pakistan are facing a very critical front. She should hope for no help from the big powers and the only solution Pakistan can have now to get rid of the dangerous time is Unity among the people for prosperity, self-sufficiency honour, prestige, respect and power of Pakistan. Unite for the sake of your country for Unity is your only hope and always remember :

UNITY IS STRENGTH SURRENDER
NEVER, SOLIDITARY EVER.